Scanned with CamScanner

Greatest Minds and Ideas of All Times

انسانی تاریخ کے عظیم ترین ذہن اور نظریات

ول ڈیورانٹ

ترجمہ: یاسر جواد

نگارشات

A translation of
"Greatest Minds and Ideas of All Times"
Written by:
Will Durant
Translated by:
Yassir Javvad
Published by:
Asif Javed

نام کتاب: انسانی تاریخ کے عظیم ترین ذہن اور خیالات
مصنف: ول ڈیورانٹ
ترجمہ: یاسر جواد
ناشر: آصف جاوید
برائے: نگارشات پبلشرز، 24۔مزنگ روڈ، لاہور
PH:0092-42-37322892 FAX:37354205
مطبع: حاجی منیر پرنٹر، لاہور
سال اشاعت: 2016ء
قیمت: -/280 روپے

اگر کوئی انسان بہت خوش ہے تو موت آنے سے پہلے اپنی مہذب میراث کا زیادہ سے زیادہ حصہ جمع کر لے گا اور اسے اپنے بچوں تک منتقل کرے گا۔ اور اپنی آخری سانس تک وہ اس کبھی ختم نہ ہونے والی میراث پر شکر ادا کرتا رہے گا اور اسے معلوم ہو گا کہ یہ ہماری غذا بخش ماں اور ہماری ہمیشہ رہنے والی زندگی ہے۔

......ول ڈیورانٹ

ول ڈیورانٹ کے اوپر مذکور قول کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں ہمارے انسانی ورثے کے کمالات کے متعلق اس کتاب کو تمام بچوں کے نام کرنا چاہوں گا، اور زیادہ تعصب سے کام لیتے ہوئے اپنے بچوں رانیلی، ٹیلر، برینڈن اور بنجمن کے نام بھی۔ میری خواہش ہے کہ وہ انسانیت کے کمالات کے متعلق جانیں اور انہیں پتا چلے کہ انسان ایسے عظیم کارنامے انجام دینے کے قابل ہے کہ جن پر دیوتا بھی رشک کریں گے۔

......جان لٹل

"انسان اور پست درجے کے جانوروں میں بہت کم فرق
ہے. زیادہ تر لوگ یہ فرق بھی مٹا دیتے ہیں."

...... ول ڈیورانٹ

تاریخ کے
عظیم ترین ذہن
اور نظریات

تعارف

1968ء میں پولٹزر انعام برائے ادب جیتنے کے کچھ ہی عرصہ بعد وِل ڈیورانٹ اور اس کی بیوی ایریئل نے ایک ٹیلی وژن انٹرویو کے لیے رضامندی ظاہر کی جو لاس اینجلس، کیلی فورنیا میں واقع ان کے گھر پر لیا جانا تھا۔ انٹرویو لینے والے نے خود کو ایک دانشور سمجھتے ہوئے ڈیورانٹ سے مندرجہ ذیل سوال پوچھا:

اگر میں آپ سے کہوں کہ تاریخ کے سب سے زیادہ متاثر شخص کا نام لیں تو کیا وہ نام کارل مارکس کا ہو گا؟

ڈیورانٹ نے لمحہ بھر توقف کے بعد جواب دیا:

اگر آپ لفظ کے وسیع ترین مفہوم میں بات کریں تو پراثر

ہونے کے معاملے میں سب سے زیادہ حصہ تکنیکی موجدوں،
ایڈیسن جیسے انسانوں کو دینا پڑے گا۔ بلاشبہ بجلی کی
ترقی نے دنیا کو کسی بھی مارکسی پراپیگنڈا کی نسبت
کہیں زیادہ منقلب کیا ہے۔ پھر اگر آپ نظریات کے اعتبار سے
سوچیں تو میرے خیال میں ڈارون کا اثر مارکس کے اثر کی
نسبت کہیں زیادہ ہے، مگر مختلف شعبے میں۔ ہمارے عہد
کا بنیادی مظہر کمیونزم نہیں؛ یہ مذہبی عقیدے کا زوال ہے
جس نے ہر قسم کی اخلاقیات پر ہر لحاظ سے اثر ڈالا اور حتیٰ
کہ سیاست کو بھی متاثر کیا، کیونکہ مذہب سیاست کا ایک
ہتھیار رہا ہے۔ لیکن آج یورپ میں اس کی حیثیت ایک
ہتھیار کی سی نہیں رہی۔ سیاسی فیصلوں کا تعین کرنے
میں اس کا کردار بہت گھٹ گیا ہے --- جبکہ پانچ سو
سال قبل پوپ دنیا کے کسی بھی سول حکمران سے زیادہ
بارسوخ تھا۔

اسی انٹرویو میں تھوڑی دیر بعد سوال کرنے والا اپنے موضوع کی طرف آیا اور پوچھا:

ڈاکٹر ڈیورانٹ، ''تہذیب کی داستان'' میں پیش کردہ
تمام کرداروں میں سے کونسے کردار کو جاننا آپ کو سب سے
زیادہ پسند آیا؟

ڈیورانٹ نے سوال پر اچھی طرح غور کیا اور پھر چہرے پر کوئی تاثر لائے بغیر جواب دیا:

''مادام ڈی پومپاڈور۔''

انٹرویو لینے والا شخص بوکھلا گیا۔

''اس کی کیا وجہ ہے؟'' اس نے پوچھا۔

جواب دیتے ہوئے ڈیورانٹ کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی، ''ہاں، وہ حسین تھی، وہ مسحور کن تھی، وہ پرکشش تھی — آپ کو اور کیا چاہیے؟''

یہاں ان دو واقعات کا ذکر کرنے کا مقصد صرف یہ بتانا نہیں کہ ڈیورانٹ انسانی تاریخ پر موجدوں اور ماہرین حیاتیات کے اثرات کے متعلق کیا خیالات رکھتا تھا، نہ ہی یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ چست جملوں کی مدد سے خود یا اپنے پیشے کو بہت زیادہ سنجیدگی سے لینے والے صحافیوں کے وار کیسے ناکام بناتا تھا (ایک بار اس نے کہا تھا کہ مزاح فلسفے جیسا ہے کیونکہ یہ دونوں زندگی کے وسیع تر تناظر سے جنم لینے والے نکتہ ہائے نظر ہیں)۔ اس کے بجائے میں دکھانا چاہتا ہوں کہ انسانی تاریخ کے افراد اور واقعات کی اہمیت کو جانچنے کے لیے اس کی رائے معلوم کرنے کی ہمیشہ کوشش کی جاتی تھی — کبھی کبھی تو ایک ہی انٹرویو میں دو مرتبہ۔

ڈیورانٹ سے اس قسم کے سوالات کے جوابات مانگا جانا قطعی قابل فہم ہے۔ جب بھی کوئی شخص گیارہ جلدوں پر محیط ''تہذیب کی تاریخ'' لکھنے کی خاطر نصف صدی تک تحقیق کرتا اور قلم اٹھاتا ہے تو ظاہر ہے لوگ جاننا چاہتے ہیں کہ اس نے اپنی محنت سے کیا نتائج اخذ کیے ہیں؛ اس کے خیال میں کونسے عہد، کونسے افراد اور کارنامے نمایاں ہیں۔ مثلاً انسانی تاریخ میں عظیم ترین مفکروں کی فہرست میں کس کس کو شمار کرتا ہے؟ کونسے شاعر اس کے خیال میں واقعتاً عظیم ہیں؛ ایسے شاعر جن کے چھیڑے ہوئے نغمے سینکڑوں ہزاروں برس بعد بھی کانوں میں گونج رہے ہیں؟ اور کونسی قطعی بہترین کتب ایسی ہیں جنھیں بامعنی اور مفید تعلیم حاصل کرنے کے لیے لازماً پڑھنا چاہیے؟ ڈیورانٹ نے اپنے کیریئر کے دوران اس بڑھتے ہوئے عوامی مطالبے کا جواب دینے کے لیے قلم اٹھایا اور مضامین کا ایک سلسلہ تحریر کیا۔ ان مضامین میں ''دس عظیم ترین مفکر،'' ''دس عظیم ترین شاعر،'' ''تعلیم کے لیے ایک سو بہترین کتب،'' ''انسانی ترقی کے دس اعلیٰ ترین موقعے'' اور ''تاریخ عالم کے بارہ اہم ترین واقعات'' شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ مضامین جریدہ میں شائع ہوئے، جبکہ دیگر لیکچرز کی صورت میں پیش کیے گئے۔ تاہم، اگر اتفاقاً ان میں سے کوئی جریدے

آپ کے ہاتھ نہیں لگ جاتا، یا ان لیکچرز میں شریک ہونا آپ کے نصیب میں نہیں تھا تو ان معاملات میں اس کے اخذ کردہ نتائج معلوم کرنا ناممکن تھا۔ خوش قسمتی سے یہ تمام مضامین زیرنظر کتاب میں یکجا کر دیے گئے ہیں۔

اس قسم کا درجہ بندی کا ایک نظام تشکیل دینا اور اسے انسانی کارناموں کے اس قدر وسیع سلسلے پر لاگو کرنا یقیناً ایک مشکل کام ہے۔ لیکن ڈیورانٹ نے ہمیشہ کی طرح اس میں شاندار کامیابی حاصل کی ہے؛ وہ نہ صرف اپنے منتخبات کی حمایت میں زوردار شہادت پیش کرتا ہے، بلکہ قاری کو اپنی آرا وضع کرنے اور اپنے گردوپیش اور موجودہ ثقافت سے بالاتر ہو کر ایک لازماں اقلیم میں جھانکنے کی تحریک بھی دلاتا ہے۔ اس نے اس اقلیم کو ''ذہن کا ملک'' کہا، ایک قسم کی دماغی عزلت گاہ جس میں نوع انسانی کے ہیروز اپنے اپنے عہد گزارنے اور مقصد پورا کرنے کے بعد رہائش پذیر ہیں اور جہاں انسان ہونا قابل ستائش بات ہے۔ واقعی اس کتاب کے پہلے باب کا عنوان تھیسس کے جوہر کی تصویر کشی کرتا ہے: ''سورماؤں کی بلاحجاب پرستش۔''

ڈیورانٹ کی تمام کتب اور بالخصوص ''تاریخ کے عظیم ترین ذہن اور خیالات'' کے صفحات میں گونجتا ہوا فلسفہ بلاجھجک طور پر ''انسانیت کی حمایت'' میں ہے اور ہمارے عقلی و آرٹسٹک ورثے کی شان نمایاں کرتا ہے۔ درحقیقت، ڈیورانٹ ایک ''نرم رو فلسفی'' اور ''ریڈیکل ولی'' کے طور پر جانا جاتا تھا، کیونکہ اس نے ہمیشہ انسانی واقعات و تاریخ میں مثبت پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش کی۔ ایک جملے میں بات کی جائے تو، ڈیورانٹ نے اپنے قلم کی مدد سے ہماری نوع کی تاریخ میں عظمت کی چوٹیوں کو منور کرنے کی راہ چنی۔

''تاریخ کے عظیم ترین ذہن اور خیالات'' کتاب میں ہمارا بہترین ورثہ شامل ہے جو آنے والی نسلوں کی تجلیل اور فائدے کے لیے منتقل ہوا؛ یہ ڈیورانٹ کی تبحر علمی، ژرف نگاہی اور عمیق ترین واقعات اور نظریات کو سادہ اور تحریک انگیز الفاظ میں واضح کرنے کی بے مثل قابلیت سے لبریز ہے۔ یہ کتاب وِل ڈیورانٹ کی تحریروں کا ایک زبردست تعارف بھی ہے اور حاصل جینیئس کی قدرپیمائی اور گائیڈ بھی جو انسانی تاریخ کے منظرنامے میں 'قابل دید' مقامات کے متعلق راہنمائی

کرتی ہے۔

یہ کتاب کئی حوالوں سے ول ڈیورانٹ کی ''ہیروز آف ہسٹری'' کا ایک زبردست اور منطقی تکملہ بھی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ''ہیروز آف ہسٹری'' میں انسانی کارکردگی کی ایک سو صدیوں کا جائزہ پیش کیا گیا، جبکہ ''تاریخ کے عظیم ترین ذہن اور خیالات'' اس کے بارے میں ڈیورانٹ کی ذاتی آرا پر مشتمل ہے۔ نیز، ''تاریخ کے عظیم ترین ذہن اور خیالات'' میں تین افراد (ڈاروِن، کیٹس اور وٹمین) کے خاکے بھی شامل ہیں جنہیں وہ بالاصل ''ہیروز آف ہسٹری'' میں شامل کرنا چاہتا تھا، لیکن ذاتی مسائل اور بیماری کی وجہ سے کتاب میں شامل ہونے سے رہ گئے (ول ڈیورانٹ 1981ء میں فوت ہو گیا اور ''ہیروز آف ہسٹری'' کے آخری ابواب مرتب ہی نہ کیے جا سکے)۔

گاہے بگاہے شاعری جیسی بلندیوں کو چھو لینے والی نثر کے ذریعے ''تاریخ کے عظیم ترین ذہن اور خیالات'' ڈیورانٹ کی ایک پرانی دعوت کی توسیع ہے...... ''بہترین سے بہتر'' کی دنیا میں داخل ہونے کی دعوت۔ اس کتاب کے توسط سے آپ جینیئس سے آشنائی پیدا کرتے اور اسے اپنا رفیق بناتے ہیں۔ اس قسم کی مہم سے حاصل ہونے والے فوائد متعدد ہیں، جیسا کہ ول ڈیورانٹ کہتا ہے:

> ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم تمام جینئس لوگوں کی افلاکی اقلیم میں کافی دیر تک رہیں اور پہلے کی نسبت زیادہ باذوق اور باسلیقہ نہ بن جائیں. اور اگرچہ ہمیں وہاں نوجوانوں والی ملال انگیز ہیجانیت نہیں ملے گی، لیکن ہم ایک پائیدار، دھیمی مسرت، ایک عمیق خوشی سے ہم کنار ہوں گے جو کبھی ہم سے جدا نہیں ہو گی.

......جان لٹل

باب 1

سورماؤں کی بلاحجاب پرستش

جوانی میں زندگی کو ایک معنویت اور تابانی عطا کرنے والے اور ادھیڑ عمری کے ٹھٹھرتے تناظروں میں مفقود متعدد مثالی نظریات میں سے کم از کم ایک ہمیشہ میرے لیے پہلے جیسا ہی منور اور راحت بخش رہا ہے — سورماؤں کی بلاحجاب پرستش۔ ہر چیز کو زمین کے برابر کر دینے والے اور کسی بھی چیز کو احترام نہ دینے والے دور میں میں وکٹوریائی عہد کے کارلائل کا ہم خیال ہوں اور میرانڈولا کی طرح عظیم انسانوں کے معبدوں میں افلاطون کی شبیہ کے سامنے اپنی شمعیں روشن کرتا ہوں۔

میں نے ''بلاحجاب'' اس لیے کہا ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آج کل زندگی یا تاریخ میں کسی جینیئس کو اپنے سے زیادہ رفیع الشان سمجھنا کس قدر خلاف رواج ہے۔ ہمارے جمہوری عقیدے نے نہ صرف تمام ووٹروں بلکہ تمام راہنماؤں کو بھی برابر کر دیا ہے؛ ہم یہ ثابت کرنے میں خوشی

محسوس کرتے ہیں کہ موجودہ دور کے جینئیس محض اوسط درجے کے لوگ ہیں، اور یہ کہ مر چکے جینئیس محض اساطیر ہیں۔ اگر ہم مورخ ایچ جی ویلز کی بات پر یقین کر لیں تو سیزر ایک بدھو اور نپولین ایک احمق تھا۔ چونکہ اپنی بڑائیاں بیان کرنا خوش اخلاقی کے منافی سمجھا جاتا ہے، اس لیے ہم یہی نتیجہ حاصل کرنے کی خاطر بڑی مکاری کے ساتھ نشان دہی کرتے ہیں کہ کرۂ ارض کے عظیم لوگ کس قدر گھٹیا ہیں۔ شاید ہم میں سے کچھ لوگوں میں یہ ایک رفیع الشان اور بے رحمانہ مرتاضیت ہے، جو ہمارے دلوں میں سے پرستش اور مدح سرائی کی باقیات بھی باہر نکال پھینکتی ہے، مبادا پرانے دیوتا واپس آ جائیں اور ہمیں پھر سے خوف زدہ کریں۔

جہاں تک اپنا معاملہ ہے تو میں اس حتمی مذہب سے چمٹا ہوا ہوں، اور اس میں ایک راحت اور تحریک دریافت کرتا ہوں جو جوانی کی بھگتی بھری سرور انگیزیوں سے زیادہ پائیدار ہے۔ عظیم ہندوستانی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کو اس نام سے پکارا جانا کس قدر فطری لگتا ہے جو اس کے ہم وطنوں نے اسے ایک عرصہ پہلے دیا تھا: گرودیو (محترم استاد)۔ کیونکہ ہم آبشاروں اور پہاڑوں کی چوٹیوں یا خاموش سمندر پر موسم گرما کے چاند کے سامنے ہاتھ باندھ کر کیوں کھڑے ہوں اور سب سے اعلیٰ کرشمے کے سامنے کیوں نہیں: ایک انسان جو عظیم بھی ہے اور اچھا بھی؟ ہم میں سے کتنے ہی لوگ محض باصلاحیت ہیں، زندگی کے کھیل میں تاک بچے، کہ جب جینئیس ہمارے سامنے کھڑا ہو تو ہم صرف خدائی کام، تخلیق کا ایک تسلسل سمجھ کر اس کے سامنے جھک سکیں۔ یہی انسان تاریخ کا حیات بخش خون ہیں، اور سیاست وصنعت ان کا محض ڈھانچہ اور ہڈیاں ہیں۔

جب جیمز ہاروے رابنسن نے ہمیں پیغام بھیجا کہ اپنے علم کو انسانی شکل دیں تو اس وقت ہمیں لاحق خشک علم الکلام کی ایک جزوی وجہ تاریخ کو شخصیات اور ''واقعات'' کے ایک غیر شخصی بہاؤ کی حیثیت میں تصور کرنا تھا — ایسا بہاؤ جس میں جینئیس نے اس قدر غیر لازمی کردار ادا کیا کہ تواریخ نے انہیں نظر انداز کرنے کو باعث فخر جانا۔ تاریخ کا یہ نظریہ سب سے بڑھ کر کارل مارکس کا مرہونِ منت تھا؛ یہ ایک تصور حیات کے ساتھ بندھا ہوا تھا جس نے غیر معمولی انسان پر بد اعتمادی پیدا کی، برتر صلاحیت پر رشک کیا اور منکسروں کو کرۂ ارض کے وارثوں کی حیثیت میں سرفرازی

دلائی۔ آخر میں انسانوں نے تاریخ کو یوں لکھنا شروع کر دیا کہ جیسے وہ کبھی زندہ ہی نہ رہے ہوں، کہ جیسے ان کا کھیل کبھی رچا ہی نہ ہو؛ جدو جہد کرتے ہوئے یا مایوسی کا شکار انسانوں کے کوئی طربیہ یا المیہ نہ ہوں۔ گبن اور Taine کے واضح بیانیوں نے بے جا فصیح البیانی کی راکھ کے ڈھیر لگا دیے جس میں ہر امر درست، دستاویزی ثبوت کا حامل اور مردہ تھا۔

نہیں، انسان کی حقیقی تاریخ قیمتوں اور اجرتوں میں نہیں، نہ ہی انتخابات اور جنگوں یا حتیٰ کہ عام آدمی کے طور طریقوں میں؛ یہ مجموعی انسانی تہذیب وثقافت میں جینئس لوگوں کی پائیدار حصہ داریوں میں مضمر ہے۔ اگر آپ پوری انکساری کے ساتھ بات کریں تو فرانس کی تاریخ فرانسیسی لوگوں کی تحریک نہیں؛ ان بے نام مرد و خواتین کی تاریخ جنہوں نے کھیت میں ہل چلایا، جوتے بنائے، کپڑا کاتا اور جھاڑ بری لگائی (کیونکہ یہ سب کام تو ہر جگہ اور ہمیشہ ہوتے ہی ہیں) ___ فرانس کی تاریخ اس کے غیر معمولی مرد و خواتین، اس کے موجدوں، سائنس دانوں، ریاست کاروں، شعرا، اہل فن، موسیقاروں، فلسفیوں اور اولیا کا ریکارڈ ہے؛ اور اپنے لوگوں اور نوع انسانی کی ٹیکنالوجی اور دانائی، فنکاری اور تمدن میں کیے ہوئے اضافوں کا ریکارڈ بھی۔ ہر ملک اور ساری دنیا میں ایسا ہی ہے؛ اس کی تاریخ اصل میں اس کے عظیم لوگوں کی تاریخ ہے۔ ہم باقی ماندہ لوگ ان کے ہاتھوں میں اینٹ اور گارے کے سوا کیا ہیں؟ چنانچہ میں تاریخ کو سیاست اور قتل وغارت کے ایک ریکارڈ کی صورت میں نہیں دیکھتا، بلکہ یہ جینئس کے توسط سے مادے کے کڑیل جمود اور ذہن کی بوکھلا دینے والی اسراریت کے ساتھ جدو جہد ہے؛ تفہیم پانے، قابو کرنے اور خود کو اور دنیا کو نئے سرے سے ڈھالنے کی جدو جہد۔

میں انسانوں کو علم کے کنارے پر کھڑا اور مشعل کو کچھ مزید آگے تک لیجاتا ہوا دیکھتا ہوں؛ انسانوں کو رفعت دینے کی خاطر مرمر میں سے صورتیں تراشتے ہوئے انسان؛ عظمت کے بہتر آلہ ہائے کار کی صورت میں لوگوں کو تشکیل دیتے ہوئے انسان؛ موسیقی کی زبان اور زبان میں سے موسیقی بناتے ہوئے انسان؛ نفیس تر زندگیوں کے خواب دیکھتے اور انہیں پورا کرتے ہوئے انسان۔ یہاں تخلیق کا عمل کسی بھی اسطورہ کی نسبت زیادہ عیاں ہے؛ کسی بھی عقیدے کی نسبت

زیادہ حقیقی الوہیت۔

اس قسم کے انسانوں پر غور وفکر کرنا، ان کی منکسرانہ شاگردی میں خود کو تہ در تہ جانچنا، انہیں کام کرتے ہوئے دیکھنا اور انہیں جلا دینے والی آگ سے خود کو حرارت دینا، یہ سب آپ میں جوانی کے ودیعت کردہ جوش وولولے کا کچھ حصہ بازیاب کرنے جیسا ہے جب ہم الطار پر یا اعتراف گاہ میں خود کو خدا سے ہم کلام یارو برو خیال کرتے تھے۔ اُس خواب ناک جوانی میں ہم یقین رکھتے تھے کہ زندگی شر ہے، اور یہ کہ صرف موت ہی ہمیں بہشت تک لیجا سکتی ہے۔ ہمارا خیال غلط تھا؛ آج بھی، بدستور قید حیات میں، ہم اس میں داخل ہو سکتے ہیں۔ ہر عظیم کتاب، ہر واشگاف فن پارہ، ایک بھگتی میں گزاری ہوئی زندگی کا ہر ریکارڈ ایک پکار، باطنی مسرت کے میدانوں کے لیے کھل جا سم سم ہے۔ ہم اپنی امید اور تقدیس کا شعلہ بجھانے میں بہت عجلت کرتے ہیں۔

آیئے، مورتیوں کو بدلیں، اور دوبارہ آرتی جلائیں۔

باب 2

دس ''عظیم ترین'' مفکر

سوچ کیا ہے؟

یہ ہر بیانیے کو جُل دے جاتی ہے کیونکہ اس میں ہر وہ چیز شامل ہے جس کے ذریعے اس کی تعریف کی جا سکتی ہو۔ یہ ہمیں معلوم سب سے زیادہ بلا واسطہ حقیقت اور ہماری ہستی کی آخری رمز ہے۔ دیگر تمام چیزیں اس کی شکلوں کے طور پر ہی ہم تک آتی ہیں، اور تمام انسانی کارنامے اپنا ماخذ و ماحصل اسی میں پاتے ہیں۔ اس کا ظہور ارتقا کے رہس میں عظیم ترین موڑ ہے۔

کرشمے کا آغاز کب ہوا؟ شاید اس وقت جب برف کے بڑے بڑے تودے قطب سے نیچے کھسکے، ہوا کو یخ بستہ بنایا، تقریباً ہر جگہ نباتات کو برباد کیا، بے بس انواع اور تطابق اختیار کرنے کی صلاحیت سے محروم جانوروں کو ختم کیا اور باقی بچنے والے چند ایک کو تنگ سی حاری (Tropical)

پٹی میں دھکیل دیا جہاں وہ پشت در پشت خط استوا سے چمٹے ہوئے شمال کے غضب کے پگھلنے کا انتظار کرتے رہے۔ غالباً انہی اہم ترین ایام میں تمام پرانے اور قبولیت یافتہ انداز ہائے حیات حملہ آور برف کے ذریعے منسوخ ہو گئے، اور موروثی یا روایتی رویے ایسے ماحول میں کامیاب نہ رہے جہاں ہر چیز بدل گئی تھی، نسبتاً مکمل مگر غیر لچک دار جبلتی صلاحیت کے حامل جانوروں کا قلع قمع ہو گیا کیونکہ وہ باہر کی تبدیلی سے نمٹنے کے لیے اپنے اندر تبدیلی نہیں لا سکے تھے؛ جبکہ ڈھلنے کی متزلزل صلاحیت سے متصف انسان نامی جانور نے گردوپیش سے سیکھا اور جنگل ومیدان کی تمام انواع پر بلا سوال بالا دستی حاصل کی۔

غالباً اسی طرح کی ایک موت وحیات کی جدوجہد میں ہی انسانی استدلال کی ابتدا ہوئی۔ آج نومولود بچے میں نظر آنے والا ادھورا پن اور ماحول سے تطابق اختیار کرنے کی صلاحیت (جو اسے کسی نومولود جانور سے گھٹیا لیکن سیکھنے کے لیے نہایت موافق بھی بناتی ہے) نے ہی انسان اور اعلیٰ درجے کے ممالیا جانوروں کو بچایا؛ میمتھ اور میسٹوڈون جیسے طاقت ور نامیاتی اجسام (جو اُس سے پہلے مطلق حکمران تھے) برفانی تبدیلی کی تاب نہ لا سکے اور محض قبل از تاریخ تحقیق کے لیے ایک تفریح بن کر رہ گئے۔ وہ ٹھٹھرے اور گزر گئے۔ جبکہ نحیف و منحنی انسان باقی رہا۔ سوچ اور ایجاد کا آغاز ہوا: بوکھلائی ہوئی جبلی گڑبڑاہٹ نے ڈرتے ڈرتے اولین مفروضے کو جنم دیا، دو اور دو کو جمع کرنے کی اولین متذبذب کاوش، اولین تعمیمات، معیار اور باقاعدگیوں کی مشابہتوں کی اولین دردناک تحقیقات، سیکھی ہوئی چیزوں کو ایسی انوکھی صورت حالات کی مطابقت میں لانا جن میں جبلتی اور براہ راست ردعمل قطعی ناکارہ ہو گئے۔ تبھی عمل کی مخصوص جبلتوں نے ارتقا کر کے سوچنے کے طریقوں اور ذہانت کے آلات کی صورت اختیار کر لی: شکار کا انتظار یا تعاقب توجہ بن گیا؛ خوف اور فرار نے احتیاط اور تدبیر کی شکل دھاری؛ جھگڑالو پن اور یلغار تجسس اور تجزیہ بن گئے؛ ترکیب تجربہ بن گئی۔ جانور نے کمر سیدھی کی اور انسان بنا۔ وہ اب بھی ہزاروں قسم کے حالات کا غلام تھا۔ اس نے لاتعداد کٹھن حالات کا سامنا کرنے کی جرات کی، لیکن اپنے سے متزلزل انداز میں کرۂ ارض کا حکمران بنا۔

انسانی استدلال کی مہم جوئی

اس دھندلے عہد سے لے کر ہمارے اپنے زمان و مکاں تک تہذیب کی تاریخ انسانی استدلال کی مہم جوئی رہی ہے۔ ترقی کے زینے پر ہر قدم پر سوچ نے ہی ہمیں آہستہ آہستہ اور مذبذب انداز میں ایک عظیم تر طاقت اور برتر زندگی کی جانب سرفراز کیا۔ اگر نظریات تاریخ کا تعین نہیں کرتے تو ایجادات کرتی ہیں؛ اور ایجادات کا تعین نظریات سے ہی ہوتا ہے۔ یقیناً خواہش، ہماری ناقابل تسکین ضروریات، بلا تکان جستجو ہی ہمیں سوچنے کی تحریک دلاتی ہے؛ لیکن جستجو چاہے کتنی بھی تحریک یافتہ یا القا یافتہ ہو، ہمیشہ فکر ہی ہمیں راستہ دکھاتی ہے۔ چنانچہ ہمیں کارلائل اور نطشے جیسے سورماؤں کے پجاریوں (جنہوں نے تاریخ کی تعبیر عظیم انسانوں کے حوالے سے کی) اور سپنسر و مارکس جیسوں (جنہوں نے تاریخی واقعات کی تہ میں صرف معاشی وجوہ دیکھیں) کے درمیان قدیم جھگڑا حل کرنے کی ضرورت نہیں؛ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر سوچ کی جلا بخش چنگاری مداخلت نہ کرتی تو معاشی حالات کا کوئی دباؤ کبھی بھی نوع انسان کو آگے بڑھانے کے لیے کافی نہ ہوتا۔

شاید Tarde اور جیمز نے ٹھیک کہا ہے، اور تمام تاریخ ایجادات کا سلسلہ ہے جنہیں جینئس نے بنایا اور لوگوں نے مروجات میں بدلا، مہم پسند راہنماؤں کی جانب سے پہل کاریوں کا ایک سلسلہ جو نقالی کی لہروں کے ذریعے ساری نوع انسان میں پھیل گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر عہد کے آغاز میں اور نقطۂ عروج میں کوئی نہ کوئی سورمائی جینئس کھڑا ہے، اپنے عہد کی آواز اور اشارہ، ماضی کا وارث اور تعبیر کنندہ، مستقبل میں راہنمائی اور پیش قدمی کرنے والا۔ اگر ہم تہذیب کی گرہ کشائی کرنے والے اس قسم کے ہر عہد کی فکر میں نمائندہ اور غالب شخصیت پاتے ہیں تو ہمیں اپنی تاریخ کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہونا چاہیے۔ لیکن ڈرامے کے اشخاص (جن کے گرد کھیل گھومتا ہے) منتخب کرنے کی طرح یہاں بھی درجن بھر مشکلات ہمیں ڈراتی ہیں۔ عظمت کو جانچنے کے لیے ہماری کسوٹی کیا ہونی چاہیے؟ ہمیں کیسے پتا چلے گا کہ انسانی جینئس کی فہرست میں کسے خارج کرنا ہے اور کسے شامل کرنا ہے؟

جانچ کے معیار

تو ٹھیک ہے، ہم یہاں بہت سخت گیری اور کٹر پن سے کام لیں گے؛ اور اگر چہ ہمارے دل ٹوٹ جائیں گے مگر ہم کسی ایسے ہیرو کو اپنی فہرست میں شامل نہیں کریں گے جس کی سوچ (چاہے وہ کتنی ہی عمیق ہو) نے نوع انسان پر ایک پائیدار اثر نہیں ڈالا۔ یہ ہماری مطلق پرکھ ہونی چاہیے۔ ہم ہر مفکر کی سوچ کے اچھوتے پن اور وسعت، صداقت اور گہرائی کو مدنظر رکھنے کی کوشش کریں گے؛ لیکن سب سے بڑھ کر یہ بات ذہن میں رکھنا ہوگی کہ انسانوں کی زندگیوں اور اذہان پر اس کا اثر کتنا وسیع اور مستقل ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم اپنے ذاتی تعصّبات کو کچھ حد تک قابو میں رکھیں اور اپنے انتخاب میں کچھ اعتدال برتیں۔

تو ہم ایک ''مفکر'' کی کیا تعریف کریں گے؟ غالباً یہ لفظ فلسفیوں اور سائنس دانوں کا احاطہ کرتا ہے — لیکن کیا صرف انہی کا؟ کیا ہم یوری پیڈیز، یا لوکریٹیئس، یا دانتے، یا لیونارڈو، یا شیکسپیئر، یا گوئٹھے جیسے لوگ بھی شامل کریں گے؟ نہیں؛ ہم اِن عظیم ناموں کے سامنے ادب سے جھکتے ہیں اور انہیں ان کی فکر کی پہنچ اور گہرائی کے باوجود ثانوی مفکروں میں شمار کرتے ہیں، کیونکہ وہ سب سے پہلے آرٹسٹ ہیں۔ کیا یسوع مسیح، یا گوتم بدھ، یا سینٹ آگسٹائن یا لوتھر جیسے نہایت بااثر راہنماؤں کو بھی شامل کرنا ہوگا؟ نہیں؛ یہ مذاہب کے بانی اور مصلحین ہماری اصطلاح سے باہر آتے ہیں؛ فکر یا استدلال کے بجائے احساس اور اعلیٰ جذبہ، ایک باطنی بصیرت اور ایک غیر متزلزل ایمان ہی تھا جس کی بدولت انہوں نے دنیا کو تحریک دلائی۔ کیا ہم اپنے دس افراد میں ان عظیم مردان عمل کو بھی شامل کریں گے جن کے نام تاریخ کے ایوانوں میں گونجتے ہیں — پیریکلیز، یا سکندر، یا سیزر، یا شارلیمان، یا کروم ویل، یا نپولین، یا لنکن؟ نہیں؛ اگر ہم ''مفکر'' کے مفہوم میں اس قسم کے ہیروز کو بھی شامل کر لیں تو اس کا ممیّز مفہوم کھو جائے گا، اور فکر کی اہمیت و وقعت ختم ہو جائے گی۔ ہمیں چاہیے کہ اس میں صرف فلسفیوں اور سائنس دانوں کو ہی شمار کریں۔ ہم ان انسانوں کو تلاش کریں گے جنہوں نے اپنی سوچ، نہ کہ عمل یا جذبے، کے ذریعے نوع انسان کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ ہم انہیں دنیا کے پرسکون کونوں میں تلاش کریں گے جہاں ان کے ذہنوں میں

عظیم افکار آئے اور جہاں انہوں نے پل بھر کے لیے صداقت کا چہرہ دیکھا۔ تو ہم سب سے پہلے کس کا نام لیں گے؟

1۔ کنفیوشس: ایک دم سے ہمارے شکوک اور جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ آخر کس اصول کے تحت ہم کنفیوشس کو شامل کریں اور گوتم بدھ اور یسوع مسیح کو خارج کر دیں؟ بنیاد صرف یہ ہے: کہ وہ مذہبی عقیدے کا مبلغ ہونے کے بجائے ایک اخلاقی فلسفی تھا؛ کہ اعلیٰ زندگی کے لیے اس کی پکار مافوق الفطرت خیالات کے بجائے ورائے مذہب (سیکولر) تحریکات پر مبنی تھی؛ کہ وہ یسوع مسیح کی نسبت سقراط سے کہیں زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔

وہ گڑبڑ سے بھرپور عہد میں پیدا ہوا (552 قبل مسیح) جب ریاست کی پرانی طاقت اور شان و شوکت جاگیردارانہ انتشار اور دھڑے بندی میں بٹ گئی تھی۔ کُنگ-فُو-زے نے اپنے ملک کی صحت اور نظم بحال کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ کیسے؟ اسی کے منہ سے سنیں:

> رفیع الشان قدمأ نے جب دنیا میں اعلیٰ ترین خوبیوں کو واضح کرنے اور پھیلانے کی خواهش کی تو اپنی ریاستوں کو منظم کیا۔ ریاستوں کا منظم کرنے سے پهلے انهوں نے اپنے خاندانوں کو قاعده دیا۔ خاندانوں کو باقاعده بنانے سے پهلے انهوں نے خود کو تربیت دی۔ اپنی تربیت سے قبل انهوں نے اپنی روحوں کو کمال تک پهنچایا۔ اپنی روحوں کو کاملیت دینے سے قبل انهوں نے اپنے افکار کے ساتھ ایمان دار هونا سیکھا، انهوں نے اپنے علم کو انتهائی حدود تک وسعت دی۔ علم کی یه جستجو چیزوں کو جانچنے اور ان کی اصل کو دیکھنے میں مضمر هے۔ چناچه جب چیزوں پر

اس طریقے سے تحقیق کی گئی تو علم مکمل ہوا۔ علم مکمل ہو جانے پر ان کے افکار ایمان دارانہ ہو گئے۔ افکار میں ایمان داری پیدا ہونے پر ان کی روحیں کمال کو پہنچیں، ان کی ذات تربیت یافتہ ہوئی۔ جب ذات تربیت یافتہ ہو گئی تو ان کے خاندان بانظم ہو گئے۔ ان کے خاندانوں میں باقاعدگی پیدا ہونے پر ان کی ریاستوں میں نظم و ضبط پیدا ہوا۔ ریاستوں میں موزوں نظم پیدا ہونے پر ساری دنیا امن اور خوشی سے بھر گئی۔

اس ایک پیراگراف میں مستحکم اخلاقی اور سیاسی فلسفہ موجود ہے۔ یہ ایک نہایت اساس پرست نظم تھا؛ اس نے دساتیر اور آداب کو تجلیل بخشی، اور جمہوریت سے تنفر کا اظہار کیا؛ زریں اصول کو واضح طور پر بیان کرنے کے باوجود یہ مسیحیت سے زیادہ رواقیت (Stoicism) کے قریب تھا۔ ایک شاگرد نے کنفیوشس سے پوچھا کہ کیا برائی کے بدلے میں نیکی کرنی چاہیے؟ کنفیوشس نے جواب دیا: ''تو پھر تم نیکی کے جواب میں کیا کرو گے؟ برائی کے جواب میں انصاف اور نیکی کے جواب میں نیکی کرو۔'' وہ تمام انسانوں کو مساوی نہیں مانتا تھا؛ اسے لگا کہ ذہانت ایک ہمہ گیر تحفہ نہیں۔ جیسا کہ اس کا شاگرد مینیئس کہتا ہے: ''انسان اور پست درجے کے جانوروں میں بہت کم فرق ہے۔ زیادہ تر لوگ یہ فرق بھی مٹا دیتے ہیں۔'' عوام کی عظیم ترین خوش نصیبی یہ ہو گی کہ وہ جاہل افراد کو عوامی عہدوں سے دور رکھیں، اور اپنے عقل مند ترین لوگوں کو حکمران بنائیں۔

ایک عظیم شہر چنگ۔تو نے اس کی بات کو من وعن لیا اور اسے مجسٹریٹ بنا دیا۔ ہمیں بتایا گیا ہے، ''لوگوں کے آداب واطوار میں ایک زبردست اصلاح ہوئی......جرم کا خاتمہ ہو گیا......بے

ایمانی اور بداعمالی نے اپنے منہ چھپا لیے۔ اخلاص اور ایمان داری انسانوں کے اوصاف بن گئے، عورتوں نے پاک دامنی اور اطاعت کو شعار بنایا۔'' صادق بننا نہایت مشکل ہے، اور غالباً یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چلا۔ لیکن کنفیوشس کے پیروکار اس کی زندگی میں ہی اس کی عظمت کو سمجھ گئے اور اس لازوال اثر کی پیش بینی کر لی جس نے اہل چین کی خوش آدابی اور متانت و ذہانت کو ڈھالا۔ ''اس کے شاگردوں نے اُسے بڑی دھوم دھام سے دفنایا۔ لوگوں کے ایک جم غفیر نے اس کی قبر کے قریب جھونپڑے تعمیر کیے اور تقریباً تین برس تک وہاں سوگ مناتے رہے، کہ جیسے ان کا باپ مر گیا ہو۔ جب باقی سب چلے گئے تو تسو۔ کنگ (جس نے اسے سب سے بڑھ کر چاہا تھا) ''مزید تین برس تک اکیلا اس کی قبر پر بیٹھا رہا۔''

2-افلاطون: اب ہمیں نئے مسائل سے سابقہ پڑتا ہے۔ ساری تہذیبیں ہمارے سامنے ہیں جن میں کوئی ایسا نام نہیں ملتا جو اس جیسا غالب ہو، کوئی ایسی طاقت ورورائے مذہب شخصیت نہیں ملتی جس نے فکر کی مدد سے اپنے لوگوں کے لیے آواز اٹھائی اور انہیں تشکیل دیا ہو۔ ہندوستان میں، یہودیوں کے ہاں، اور ایشیائے کوچک کے ''زرخیز ہلال'' کی خانہ بدوش نسلوں کے درمیان بھی یہی صورت حال ہے: ہمارے پاس ایک گوتم بدھ، ایک یسعیاہ، ایک یسوع مسیح اور .... ہے، لیکن کوئی دنیوی سائنس دان نہیں، کوئی دنیوی فلسفی نہیں۔ اور ایک اور معاملے میں — شاید آج تک دنیا کی نہایت پائیدار اور عالیشان تہذیب — ہمارے پاس ایک سوفراعین اور متنوع آرٹ کے لاتعداد متبرکات ہیں، لیکن کوئی بھی نام اس شخص کا مدمقابل نہیں جو ماضی کو دانش کے تناظر میں لایا اور اپنی قوم کی عقلی ترقی پر چھاپ ڈالی۔ ہمیں ان لوگوں اور ان صدیوں سے احترام کے ساتھ گزرنا ہوگا، اور پیریکلیز کے عہد کے یونان کی رفعتوں پر دھیان دینا پڑے گا۔

ہم افلاطون سے محبت کیوں کرتے ہیں؟ کیونکہ افلاطون خود بھی محبت کرنے والا تھا: ساتھیوں کا عاشق، جدلیاتی نشاط انگیزی کے خمار کا عاشق، افکار و اشیا کی تہ میں موجود چھلیا حقیقت کا متلاشی۔ ہم اس کی فیاض توانائی، اس کے تخیل کی سیلانی ترنگ، زندگی میں اس کی حاصل کردہ تمام

مسرت کی وجہ سے اسے محبت کرتے ہیں۔ ہم اسے چاہتے ہیں کیونکہ وہ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ جیا، اور کبھی بھی آگے بڑھنے کا عمل نہ روکا؛ اس قسم کے آدمی کی تمام خطاؤں کو معاف کیا جا سکتا ہے۔ ہم اسے پسند کرتے ہیں کیونکہ وہ ذہین حکمرانوں کے ذریعے سماجی تعمیر نو کا زبردست شوق رکھتا تھا؛ کیونکہ اس نے اپنی زندگی کے تمام 80 برسوں میں انسانی بہتری کے لیے وہ جوش و جذبہ قائم رکھا جو ہم میں سے زیادہ تر لوگوں کے لیے محض جوانی کا عارضی تعیش ہے؛ کیونکہ اس نے فلسفے کو محض تعبیر کا ہی نہیں بلکہ دنیا کی تشکیل نو کا آلۂ کار بھی تصور کیا۔ ہم اس سے محبت کرتے ہیں کیونکہ اس نے صداقت کے ساتھ ساتھ حسن کی بھی پرستش کی اور تصورات کو ڈرامائی جانداری عطا کی، اور انہیں آرٹ کی تابانی میں ملبوس کیا۔ ''جمہوریہ'' اور ''مکالمات'' میں تخلیقی تخیل کا ایسا بے پایاں کھیل رچا ہوا ہے کہ جو ایک شیکسپیئر بنا سکتا ہے؛ یہاں تخیل شاہانہ دست برداری کے ساتھ قلانچیں بھر رہا ہے؛ یہاں وہ مزاح ملتا ہے جو ہمارے جدید دقیق فلسفیوں کے ہاں مفقود ہے؛ یہاں کوئی نظام نہیں مگر تمام نظام ہیں؛ یہاں یورپی فکر کا وافر سرچشمہ موجود ہے؛ یہاں ان عظیم معبدوں جیسی طاقت ور اور خوب صورت شاعری ملتی ہے جہاں یونانی مسرت مرمر میں جلوہ گر ہوئی؛ یہاں ادبی نثر کا جنم ہوا اور بالغ جنم۔

چنانچہ افلاطون ہمارا دوسرا نام ہونا چاہیے۔ لیکن ہمیں ایک نہایت معقول چیلنج کے خلاف اس کا دفاع کرنا ہوگا: بوڑھے سقراط کا کیا بنے گا جو فلسفے کا بانی اور یقیناً عظیم ترین شہید بھی تھا؟ اسے ایسی فہرست میں سے باہر رکھنا مضحکہ خیز لگے گا جس میں شامل ہیروز اس کی عظمت کا نصف بھی نہیں۔ قاری کو یہ جان کر دھچکا لگے گا کہ سقراط نصف اسطورہ اور نصف انسان ہے۔ ایک فاضل فرانسیسی M. Dupreel نے (اپنی کتاب La Legende Socratique میں) اس کی حیثیت گھٹا کر ایکلیز، ایڈیپس، رومیولس اور سیگفرائیڈ جیسی تاریخی سطح پر پہنچا دی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری موت کے بعد کوئی زیادہ باریک بین اور باضمیر محقق ثابت کر دے گا کہ سقراط کبھی تھا ہی نہیں۔ لیکن ہم کافی حد تک یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ سقراط بطور فلسفی اپنی شہرت کے لیے افلاطون کے تخلیقی تخیل کا مرہون منت ہے۔ افلاطون ہی تھا جس نے رفیع الشان آوارہ گرد کو اپنے نظریات

کا بیان کنندہ بنایا۔ شاید ہم کبھی نہیں جان پائیں گے کہ افلاطون کا سقراط کس حد تک سقراط اور کس حد تک افلاطون تھا۔ چلیں افلاطون کو دونوں کا نمائندہ مان لیتے ہیں۔

اس کے ''مکالمات'' نوع انسانی کی بیش بہا املاک میں سے ایک ہیں۔ یہاں پہلی مرتبہ فلسفے کی صورت گری ہوئی اور اس نے اپنے شباب میں ایسی کاملیت پائی کہ بعد کے زمانوں میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ کیا آپ محبت اور دوستی کے متعلق اعلیٰ ڈسکورس سننے کے خواہش مند ہیں؟ — ''لائسس''، ''کارمیدیس'' اور ''فیدرس'' پڑھیں۔ کیا آپ جاننا چاہتے ہیں کہ ایک عظیم اور مشفق شخص — افلاطونی سقراط — اگلی زندگی کے بارے میں کیا سوچتا تھا؟ — ''فیدو'' پڑھیں جس کے آخری صفحات نثر کی تاریخ میں چند اعلیٰ ترین مثالیں پیش کرتے ہیں۔ کیا آپ ذہن کی الجھنوں، علم کی اسراریت میں دلچسپی رکھتے ہیں؟ — ''جمہوریہ'' پڑھیں: یہاں آپ کو مابعد الطبیعات، دینیات، اخلاقیات، نفسیات، نظریۂ تعلیم، نظریۂ ریاست کاری، نظریۂ آرٹ ملے گا؛ یہاں آپ نسوانیت پسندی اور ضبط تولید، کمیونزم اور سوشلزم اپنی تمام تر خوبیوں اور مشکلات سمیت، انتخابی بنیادوں پر نسل کشی، ارستقراطیت اور جمہوریت، حیویت اور تحلیل نفسی پائیں گے — کیا ہے جو آپ کو اس میں نہ ملے؟ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ ایمرسن نے ''جمہوریہ'' کے متعلق کہا تھا: ''کتب خانوں کو جلا دو، کیونکہ ان کی تمام قابل قدر باتیں اس کتاب میں ہیں۔''

افلاطون کے اثرات پر ہم شک کیسے کر سکتے ہیں؟ اس کی قائم کردہ اکیڈمی پر غور کریں، دنیا کی پہلی اور سب سے زیادہ عرصہ تک قائم رہنے والی یونیورسٹی۔ سکندریہ کے نوفلاطونیوں سے لے کر انگلینڈ کے کیمبرج فلاطونیوں تک افلاطون کے فلسفے کی متواتر بحالی پر غور کریں۔ افلاطونی فکر اور علامتیت کے ساتھ مسیحی الٰہیات کے پھیلاؤ پر غور کریں، اور قرون وسطیٰ کی ثقافت میں افلاطون کی غالب حیثیت دیکھیں۔ نشاۃ ثانیہ کی پرجوش فلاطونیت کے متعلق سوچیں جب لورینتسو کی میز نے ''سمپوزیم'' کی کچھ شان و شوکت کو دوبارہ سے پیش کیا، اور پیکو میرانڈولا نے گرو کی شبیہ کے سامنے عقیدت کے ساتھ شمعیں روشن کیں۔ غور کریں کہ اس لمحے سینکڑوں ممالک اور ہزاروں شہروں میں بوڑھے اور جوان ''جمہوریہ'' یا ''مکالمات'' میں کھوئے ہوئے ہیں، افلاطون کا جذبہ

اور لطافت انہیں ایک حساس دانش میں ڈھال رہی ہے۔ یہاں روح کی ایک لافانیت پائی جاتی ہے جو جسم کی تحلیل کو تقریباً بے وقعت بنا دیتی ہے۔

3-ارسطو: ساری دنیا اتفاق کرے گی کہ ارسطو کو ہماری فہرست میں شامل ہونا چاہیے۔ قرون وسطیٰ میں اسے ''فلسفی'' کہا گیا، کہ جیسے وہ کمال یافتہ فلسفیوں کا کامل ترین نمونہ ہو۔ ایسی بات نہیں کہ ہم اس سے محبت نہیں کرتے؛ اس کی چھوڑی ہوئی کتب اس قدر یک رنگی کے ساتھ ایک بے جذبہ اعتدال عیاں کرتی ہیں کہ افلاطون کی تابانی محسوس کرنے کے بعد ہم اس ٹھوس ذہن کو چھونے پر جم جاتے ہیں۔ لیکن اسے اس کی کتابوں کے ذریعے جانچنا زیادتی ہوگی؛ اب ہم جانتے ہیں کہ وہ محض اس کے عجلت میں لیے ہوئے نوٹس ہیں؛ کبھی کبھی شاگردوں نے بھی راہنمائی یا لیکچرز کو یاد رکھنے کی غرض سے وہ نوٹس تیار کر لیے؛ ان تکنیکی نوعیت کے شذروں کا موازنہ ان صریح مکالمات کے ساتھ کرنا لغو ہوگا جن کے ذریعے افلاطون نے پہلی مرتبہ عوام میں فلسفے کے شائق پیدا کیے تھے۔

لیکن آیئے متکلمانہ اصطلاحات اور تحقیر آمیز انداز میں مرتکز فکر کی رکاوٹ کو ایک مرتبہ عبور کر لیں۔ تب ہم خود کو ایک تقریباً ناقابل یقین گہرائی اور وسعت کی حامل ذہانت کے حضور پائیں گے۔ یہاں کرۂ ارض کا ایسے شاندار انداز میں احاطہ کیا گیا ہے کہ تب کے بعد کوئی اور ذہن ایسا نہیں کر سکا؛ یہاں سائنس اور فلسفے کے ہر مسئلے کو زیرِ غور لایا، اجاگر کیا اور ایک قابل دفاع حل تجویز کیا گیا ہے؛ یہاں علم جیسے ایک ہزار جاسوسوں کے ذریعے مجتمع اور ایک متحد تصورِ دنیا میں مربوط ہو رہا ہے۔ یہاں فلسفے کی زبان نے جنم لیا اور آج ارسطو کے دماغ کی ٹکسال میں ڈھالی گئی اصطلاحات استعمال کیے بغیر سوچنا بہ مشکل ہی ممکن ہے۔ یہاں دانش ہے: متین، پرسکون، معتدل اور تقریباً کامل، کہ جیسے ایک بے پایاں ذہانت شاہانہ انداز میں زندگی پر چھائی ہو۔ یہاں نئے علوم موجود ہیں، لاپرواسے انداز میں قائم کردہ، کہ جیسے انسانی عقل کی یہ مطلق تخلیقات محض ایک فلسفی کی تفریحات ہوں؛ یہیں پر حیاتیات کا ظہور ہوا، اور جنینیات اور منطق کا بھی۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی

انسان نے قبل ازیں ان معاملات پر سوچا ہی نہیں تھا، بلکہ بات یہ ہے کہ کسی نے بھی اپنی سوچ کو صابرانہ مشاہدے، محتاط تجربے اور نتائج کی منظم ترتیب کے ساتھ منضبط نہیں کیا تھا۔ فلکیات اور طب کو چھوڑ کر، سائنس کی تاریخ کا آغاز اس بے تھکن دیو کی انسائیکلو پیڈیائی عرق ریزیوں سے ہی ہوتا ہے۔

اکیلے ارسطو نے ہی عظیم اثر مرتب کیا۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ سکندریہ کے مقام پر اور شاہی روم میں ارسطو کا کام ترقی کرتی ہوئی سائنس کی بنیاد بنا تھا؛ تیرہویں صدی میں مُوروں کے ذریعے نو بیدار شدہ یورپ تک لائی ہوئی اس کی فلسفیانہ تحریروں نے علم الکلام کی ترقی کے لیے کیسے کھاد کا کام کیا؛ اس پرخروش عہد کی عظیم حاصلات کیسے ''مابعد الطبیعات'' ''اور گانن'' کی محض اختیار کردہ صورتیں ہی تھیں؛ دانتے نے ارسطو کو تمام مفکرین میں اول درجہ کیسے دے دیا— ''اہل علم کا گرو''؛ کس طرح قسطنطنیہ اس کی فکر کے آخری گمشدہ خزانے نشاۃ ثانیہ کے پرشوق طلبا تک لایا؛ اور کس طرح تاریخ کے ایک ہزار سال سے زائد عرصہ پر ایک آدمی کی پراطمینان بادشاہت اوکم (Occam) اور رامیوس کی بے باک گستاخی، راجر بیکن کی تجرباتی سائنس اور فرانسس بیکن کے ندرت پسند فلسفے کے ساتھ ہی اختتام کو پہنچی۔ اس زیر تحقیق دنیا کے سفر میں ہمیں اور کوئی ایسا نام نہیں ملے گا جس نے اس قدر طویل عرصے تک انسانی اذہان کو جلا اور بصیرت بخشی ہو۔

4- سینٹ تھامس آکوینس: چنانچہ یونان تو پیچھے رہ گیا اور ہم روم پہنچتے ہیں۔ وہاں کونسے عظیم مفکرین تھے؟ سب سے پہلے اور سب سے اعلیٰ لوکریٹیئس۔ تاہم، اس کا فلسفہ اپنا نہیں تھا، بلکہ انکساری کے ساتھ اپی قورس کے نام سے منسوب کیا گیا تھا اور اپنے لوگوں اور آنے والی نسلوں پر اس کا اثر باطنی اور خال خال تھا؛ اس نے صرف اعلیٰ ترین اذہان کو چھوا۔ لہٰذا ہم اسے اپنے دائرے میں سے باہر نکال دیتے ہیں۔ دنیا کے ادب میں اس کی اعلیٰ حیثیت ڈھارس بندھانے کو کافی ہے۔ یہی معاملہ سینیکا اور ایپک ٹیٹس اور آریلیئس کا ہے، وہ بھی اہل یونان کی بازگشت تھے؛ انہوں نے مرگ آمادہ روم سے زینو کی لاتعلقی کو ہی اپنے انداز میں اختیار کیا تھا۔ جب انہوں نے

قلم اٹھایا تو قدیم تہذیب تحلیل ہو رہی تھی؛ اس کے لوگوں کے سوتوں میں سے طاقت رخصت ہو چکی تھی؛ ہر جگہ آزاد انسانوں کی جگہ غلاموں نے لے لی تھی، اور ماضی کے متفاخر آزاد شہر باجگزاری اور خراج کے جوئے تلے آ چکے تھے۔ حکمران طبقے نے خود کو بے لگام اپی قوریوں میں تقسیم کر لیا تھا، یا سپارٹائی رواقی اس قدر عسکری انداز میں سخت گیر ہو چکے تھے کہ فلسفے کی مسرتوں میں مشغول نہیں ہو سکتے تھے۔ اچانک قدیم عمارت زمیں بوس ہوئی، اور یورپی تہذیب کے کھنڈرات بن گئے۔

اس کا دوبارہ آغاز اس وقت ہوا جب کلیسیا نے مقابل دھڑوں کے افتراق کا علاج لفظ کی باطنی حاکمیت کے ساتھ کیا، اور انسانوں کو جنگی میدانوں سے نکال کر واپس ایک آباد زندگی کی طرف لایا۔ شہنشاہ گزر گئے، پوپ باقی رہے؛ اب فوجی دستے مارچ نہیں کرتے تھے، بلکہ ابھرتے ہوئے مذہب کے راہبوں اور مبلغوں نے ایک بالکل نیا نظام تخلیق کیا جس میں فکر ایک مرتبہ پھر نشوونما پا سکتی تھی۔ باشعور یورپی ذہن کا یہ دوسرا عنفوان شباب کس قدر طویل اور بے کیف تھا! آج بھی ہم روشن خیالی میں اس قدر نازک طریقے سے قائم ہیں کہ ان بہت سے برسوں کے ٹٹولتے ہوئے ہاتھ ہنوز (جیسے حافظے میں) محسوس ہوتے ہیں۔

تب تجارت کو فروغ ملا، قصبات شہروں میں بدلے، سکولوں نے یونیورسٹیوں کی شکل اختیار کی؛ ایک بار پھر نوع انسانی کے کچھ حصے کے لیے محنت و مشقت سے آزاد ہو کر فکر کے عیش و عشرت میں مشغول ہونا ممکن ہوا۔ ایبے لارڈ نے نصف براعظم کو اپنی فصیح البیانی سے ہلا کر رکھ دیا۔ بوناوینچور اور اینسلم نے شان دار الٰہیات میں قرون وسطیٰ کے عقیدے کی منطقی بنیاد رکھی۔ تیاری مکمل ہو جانے پر ایک اور ارسطو آیا — آکوینو کا سینٹ تھامس، ایک انسان جس نے اپنی دلچسپی کی کائنات کو لیا اور علم و عقیدے کے درمیان کھائیوں پر عقل کا ایک نازک پل باندھا۔ دانتے نے کیتھولک نشاۃ ثانیہ کی امیدوں اور خدشات کے ساتھ جو کیا تھا، وہی کچھ آکوینس نے اس کی فکر کے معاملے میں کیا: علم کو متحد کیا، اس کی تشریح کیا اور اسے زندگی و موت کے عظیم مسائل پر مرکوز کر دیا۔ اب دنیا اس کی پیروی نہیں کرتی اور ایک متشکک تھامس کو ایک راسخ العقیدہ تھامس پر ترجیح دیتی ہے، لیکن ایک دور ایسا تھا جب ہر عقل نے اینگلک امام کو عزت دی اور ہر فلسفی نے اس کی ضخیم

"Summae" کو اپنے دیباچے کا حصہ بنایا۔ آج بھی ایک سو کے قریب یونیورسٹیوں، ایک ہزار کالجوں میں اس کی فکر کو سائنس سے بھی زیادہ پائیدار اور مستحکم مان کر احترام دیا جاتا ہے اور اس کا فلسفہ مسیحی دنیا میں طاقت ور ترین کلیسیا کا اختیار کردہ نظام ہے۔ شاید ہم نے اس کو ایسے محبت نہ کی ہو جیسے باغیوں اور فلسفے کے شہدا کو چاہا، لیکن ایک عظیم صدی میں اس کی منکسرانہ بالادستی اور لاکھوں کروڑوں انسانوں پر وسیع اثرات کے باعث ہمیں فکر کی فہرست میں اسے جگہ دینا ہی ہوگی۔

بلاشبہ اس انتخاب کی وجہ سے کچھ دل ٹوٹ جائیں گے، مصنف کے اپنے دل سمیت۔ اور بھی بہت سے نام ایسے ہیں جنہیں آپ آکوینس کی جگہ پر رکھ سکتے تھے، ایسے نام جو جدید دنیا کو کہیں زیادہ عزیز ہیں؛ سپینوزا اور نطشے جیسے نام، جن کے لیے آپ محض عقلی عقیدت کے بجائے پرشوق محبت رکھتے ہیں۔ لیکن اگر ہم نے اپنے ہی قائم کیے ہوئے معیاروں پر پورے نہیں اترنا تو یہ کوشش یہیں پر ترک کر دینی چاہیے؛ ورنہ ہماری فہرست عظیم اذہان کی گیلری کے بجائے پسندیدہ افراد کا البم بن کر رہ جائے گی......

5- کاپرنیکس: اور تب پولینڈ سے صدا آئی جس نے کہا کہ یہ کرۂ ارض، خدا کا پائیدان اور اس کی نجات بخش زیارت گاہ ایک بے وقعت سے سورج کا بے وقعت سا سیارچہ تھا۔ یہ بہت سادہ سی بات لگتی تھی؛ آج ہم اس سے خوف زدہ یا حیران نہیں ہو سکتے؛ ہم اپنے پیروں تلے موجود مٹی کو بس یونہی ایک گریزاں شئے مان لیتے ہیں، عارضی طور پر باہم گھتے ہوئے عناصر کا انبوہ جو منتشر ہو جائے گا اور آواز تک نہیں آئے گی۔ لیکن قرون وسطیٰ کی دنیا — جس کے سارے فلسفے کی اساس خدا کو کرۂ ارض کے عین پڑوس میں سمجھنے اور انسان کے لیے معبود کی متواتر فکرمندی پر تھی — کی نظر میں یہ نئی فلکیات ایک جمالیاتی گستاخی تھی، ایک بے رحمانہ وار جس نے فرشتوں اور انسانوں کے درمیان یعقوبؑ کی بنائی ہوئی سیڑھی کو شاید توڑ ڈالا تھا۔

کاپرنیکس کی کتاب "On the Revolūtions of Celestial Orbs" اسم بامسمیٰ تھی، کیونکہ تاریخ میں کسی بھی کتاب نے انقلاب بپا نہیں کیا تھا۔ عقل دنگ کر دینے والے ستاروں کے

سامنے صابرانہ انداز میں بیٹھے ہوئے متقی پولش راہب کا ارادہ کوئی نقصان پہنچانے کا نہیں تھا: وہ اپنی فکر کے باعث مستقبل میں عقیدے پر ہونے والے اثرات کا شبہ بھی نہیں رکھتا تھا: اسے یقین تھا کہ تمام صداقت اچھی اور خوب صورت ہی ہو گی اور انسان کو آزادی دلائے گی۔ چنانچہ اپنے ریاضی کے جادو کی بدولت اس نے زمین اور انسان کو مرکز ماننے والی ایک کائنات —— ایک دنیا جو کرۂ ارض اور انسان کے گرد گھومتی تھی —— کو بدل کر ستاروں اور سیاروں کی ایک سیر بین بنا دیا جس میں کرۂ ارض تیرتے ہوئے نیبولا کا محض عارضی سا ذرہ معلوم ہوتا تھا۔ ہر چیز بدل گئی —— فاصلے، وقعتیں، قسمتیں۔ اور خدا، جو پیروں اور ہاتھوں سے زیادہ نزدیک ہوا کرتا تھا، جو دوستانہ اور تیرتے ہوئے بادلوں میں مقیم لگتا تھا، ایک غیر محدود خلا کی بے پایانی میں غائب ہو گیا۔ یوں سمجھ لیں کہ انسان کے مکان کی دیواریں کسی اندھی اور غضب ناک آندھی نے اکھیڑ کر دور پھینک دی تھیں، اور اسے لامحدودیت کی تاریکی میں بے مکان چھوڑ دیا تھا۔

ہم نہیں جانتے کہ کاپرنیکس کتنا گہرا مفکر تھا۔ بس اس کی تصنیف کے اتھاہ اثرات سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس سے جدیدیت کا آغاز ہوا۔ وہی سیکولرازم کا مبدا تھا۔ اس نے ایک عقیدے کے خلاف انقلاب فرانس کو ناقابل فراموش طور پر تخت نشین کیا، اور انسان نے اپنے خوابوں کے ریزہ ریزہ ہو چکے محل کو فکر کی مدد سے دوبارہ تعمیر کرنے کی طویل کوشش شروع کی۔ افلاک محض آسمان اور خلا اور لاشئے بن گئے، یا کرۂ ارض پر اتر آئے اور کبھی بہشت کی تمنا کرنے والے انسانوں کے پیاسے دلوں میں یوٹوپیا کے بیج بوئے۔ یہ افلاطون کی بیان کردہ تمثیل جیسا ہی تھا جس میں دیوتاؤں نے انسان کے بالغ ہو جانے تک اس کا خیال رکھا اور پھر اپنی ذہانت کے آلہ ہائے کار دے کر غائب ہو گئے۔ یہ قدیم قرون وحشت جیسا تھا جب قبیلے کا بزرگ نوجوان لڑکوں کو نکال کر کہتا کہ جا کر کوئی اور کھیت ڈھونڈیں اور گھر بنائیں اور اپنی مسرت تلاش کریں۔ کاپرنیکی انقلاب کے ساتھ انسان بلوغت پانے پر مائل ہوا۔

6-سر فرانسس بیکن: وہ اپنی اچانک بلوغت سے ڈگمگایا نہیں۔ اس کے برعکس

کاپرنیکس کے بعد کی صدی ہر شعبے میں پر شباب بے باکی اور شجاعت کی صدی تھی۔ چھوٹی چھوٹی کشتیاں گول اور محدود کرۂ ارض کو کھنگالنے لگیں؛ کمزور اذہان عقلی کرے کو کھوجنے لگے؛ انہوں نے عقیدے کی پروانہ کی، روایت سے ہراساں نہ ہوئے اور انسانیت کے ناکام ہونے کا خواب میں بھی نہ سوچا۔ آہ، روشن نشاۃ ثانیہ کے زمانے کا وہ جوش و جذبہ، جب ایک ہزار برسوں کی غربت کو تقریباً بھلا دیا گیا، اور ایک ہزار برسوں کی محنت و مشقت نے انسانوں کو زیادہ امیر اور جراتمند بنا دیا تھا؛ وہ حدود و قیود کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے! ان ہوشیار نگاہوں کی چمک، ان چوڑے چکلے جسموں میں توانا خون، ان کے شاندار لباس کے حرارت بخش رنگ، بلا جوش گفتار کی وہ برجستہ شاعری، ناقابل تسکین خواہشات، نو آزادی یافتہ اذہان کی وہ جستجو اور ولولہ اور بے خوفی — کیا ہم پھر کبھی یہ دن دیکھ سکیں گے؟

ہم اس تخمیر انگیز عہد کی آواز اور علامت کے طور پر کس کا نام لے سکتے ہیں؟ لیونارڈو؟ — مصور، موسیقار، سنگ تراش، منبت کار، ماہر تعمیرات، اناٹومسٹ، فزیالوجسٹ، طبیعات دان، موجد، انجینئر، کیمیا دان، فلکیات دان، ماہر ارضیات، ماہر حیوانیات، ماہر نباتات، جغرافیہ دان، ریاضی دان اور فلسفی! افسوس کہ وہ ہماری تعریفوں اور کسوٹیوں پر پورا نہیں اترتا: وہ بنیادی طور پر ایک آرٹسٹ تھا (ہے نا؟)، اور فلسفی یا سائنس دان کی حیثیت ثانوی تھی؛ ہم اسے اُس کی ''Last Supper'' اور ''مونا لیزا'' کی بدولت جانتے ہیں، نہ کہ فوسلز کے متعلق تھیوری، یا ہاروے کی پیش بینی یا ہمہ گیر اور ابدی 'قانون' کی زبردست بصیرت کی وجہ سے۔ یا کیا ہم جورڈانو برونو/ Giodano Bruno کا نام لے سکتے ہیں — پیہم جستجو میں مشغول روح، محدود سے غیر مطمئن، ناقابل پیمائش وحدت کا پیاسا، تقسیمات، فرقوں، عقائد اور مسالک سے برافروختہ، صرف سرمائی ہواؤں سے کم منہ زور، صرف کوہ ایٹنا سے کم آتشیں، اور اپنے شورش انگیز جذبے کی وجہ سے ہی شہید کی موت کا مقدر رکھنے والا؟

نہیں، وہ برونو نہیں ہو سکتا، کیونکہ ایک اس سے زیادہ عظیم شخص موجود تھا: ''وہ شخص جس نے گھنٹہ بجا کر تمام دانش مندوں کو بلایا''؛ جس نے ہر کہیں صداقت کے عاشقوں اور خادموں کو چیلنج

بھیجا کہ ایک نئے نظام اور سائنس کی زیر قیادت خود کو متحد کر لیں؛ جس نے اعلان کیا کہ فکر کا مشن بے کار متکلمانہ مناظرت یا بے کیف اکیڈمک قیاس بازی نہیں، بلکہ قوانین فطرت کی استنباطی تفتیش اور حالات حیات پر انسان کی قدرت کو مبہم انداز میں توسیع دینا ہے: وہ شخص جس نے شاہانہ حاکمیت کے سے انداز میں تحقیق کے غیر مفتوح شعبوں کو جانچا، ایک سو سائنسوں کو ان کے کاموں پر لگایا اور ان کی ناقابل یقین فتوحات کی پیش گوئی کی؛ جس نے برطانیہ عظمیٰ کی رائل سوسائٹی اور فرانس کے عظیم ''انسائیکلو پیڈیا'' کو تحریک دلائی، جس کی بدولت انسانوں نے علم کو مراقبے کے بجائے تشکیل نو کرنے والی قوت کے طور پر لینا شروع کیا؛ جس نے غیر مشاہداتی استدلال کی ارسطوئی منطق کو اٹھا کر پھینکا اور سائنس کی نظر فطرت کے خود انکشافی چہرے کی جانب موڑی؛ جس نے اُس وسیع عہد کے کسی بھی اور انسان سے کہیں زیادہ اپنی بہادر روح کو جدید ذہن کے بھرپور جذبے اور غایت تک پہنچایا۔ بلاشبہ یہ شخص فرانسس بیکن ہی تھا۔

7-سر آئزک نیوٹن :اس زمانے سے لے کر ہمارے زمانے تک یورپی عقل کی تاریخ قرون وسطیٰ والے نظریۂ دنیا کے برخلاف غالب طور پر بیکنی ترقی کی تاریخ رہی ہے۔

غالب طور پر لیکن متواتر نہیں؛ بہت سی شخصیات ایسی ہیں جو اس شاہراہ سے پرے کھڑی رہیں۔ ڈیکارٹ کے ہاں نئے خیالات قدیم خیالات کی جکڑ میں چھٹپٹا رہے ہیں اور خود کو مکمل طور پر آزاد نہیں کروا پاتے؛ لیبنز کی عظیم روح میں قرون وسطیٰ کی روایت ہنوز اتنی طاقت ور ہے کہ ایک ریاضی دان کو متزلزل الٰہیات دان بنا کر رکھ دے؛ اور ایمانوئیل کانٹ کے ہاں جدی پشتی عقیدے کی آواز روشن خیالی کی تشکیک پسندی میں بھی سنائی دیتی ہے۔ فکر کے ان دو دھاروں — سائنسی اور مذہبی — کے درمیان انوکھے انداز میں پل بنے ہوئے سپینوزا کی شخصیت کھڑی ہے: عدسوں کو صیقل کرنے والا اور صوفی شخص؛ تنہا قیاس آرائی کا خاموش بھگت، اور جدید سائنس کی مابعد الطبیعات کا تشکیل کنندہ؛ مکینکس اور جیومیٹری کا عاشق، اور فلسفے پر شہادت میں برونو کا ہم پلہ جس کی موت ست رو اور نسبتاً گمنامی میں تھی۔ اس کے بعد آنے والے ہر عمیق ذہن، ہر مورخ نے اس

کی دانائی کی عمق کو مانا۔ لیکن ہم نے دنیائے ذہن کے ان سورماؤں کو دانش کے ذاتی تخمینوں کے بجائے اثرات کے معروضی حوالوں سے جانچنے کا عہد کر رکھا ہے، اور سپنوزا کو بہت زیادہ پسند کرنے والے کسی شخص کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ''زم خوفلسفی'' کا شفا بخش لمس عوام یا حتیٰ کہ نوع انسان کے طبقات کے بجائے کمیاب اور رفیع تر نفوس تک ہی پہنچا۔ وہ فکر کی محدود ارسٹوکریسی سے تعلق رکھتا ہے، اور ابھی تک دنیا نے اسے استعمال نہیں کیا۔

لیکن سر آئزک نیوٹن کے معاملے میں ایسا کوئی جھگڑا نہیں۔ سکول کا ہر بچہ اس کے غیر حاضر دماغ جینیئس کی کہانی سے واقف ہے؛ کیسے اس عظیم سائنس دان کو کھانے کے لیے تین منٹ تک انڈہ ابالنے کو کہا گیا اور وہ اپنی گھڑی پانی میں ڈال کر انڈے کو ابلتا دیکھتا رہا؛ یا کیسے اس مجذوب ریاضی دان نے رات کے کھانے سے پہلے کپڑے بدلنے کے لیے اپنے کمرے میں جاتے ہوئے کپڑے اتار ڈالے اور خوشی خوشی بستر میں لیٹ گیا (اگر یہ خوش کن کہانیاں سچی نہ ہوئیں تو بہت افسوس ہو گا)۔ سکول کے بہت سے بچے نہیں جانتے کہ نیوٹن کی کتاب ''Principia'' اس مفروضے سے متصف تھی جس کی بدولت وہ آج جدید فکر پر بے مقابل قدرت کا مالک ہے؛ کہ نیوٹن کے قائم کردہ قوانین حرکت اور مکینکس بعد کی تمام پیش رفت کی بنیاد بنی؛ تجاذب کی دریافت نے فلکیات کی ساری دنیا کو روشن کر دیا اور ستاروں کی چکا چوند گڈ مڈ کو ایک تقریباً نامیاتی وحدت عطا کی۔ وولٹیئر نے کہا، 'زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب ممتاز لوگوں کا ایک گروہ گھسے پٹے اور بھونڈے سوال پر بحث کر رہا تھا'' (افسوس کہ یہ ایک بے محل اقتباس ہے)، ''کہ عظیم ترین آدمی کون ہے — سیزر، سکندر، تیمور لنگ یا کرومویل؟ کسی نے جواب دیا کہ بلاشبہ آئزک نیوٹن عظیم ترین تھا۔ اور یہ بالکل بجا تھا: کیونکہ وہی صداقت کی قوت کے ذریعے ہمارے اذہان پر قادر ہے، اور ہم انہی لوگوں کے احترام کے پابند نہیں جنہوں نے انہیں تشدد کے ذریعے غلام بنایا۔'' دنیا اس کے دور میں ہی سمجھ گئی تھی کہ نیوٹن اس کے ہیروز میں سے ہے۔

8- **وولٹیئر**: یہ وولٹیئر ہی تھا جس نے فرانس کو نیوٹن کے مکینکس اور لاک کی نفسیات سے

متعارف کروایا اور یوں روشن خیالی کا عظیم عہد شروع ہوا۔ متکلمانہ اذہان یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ وولٹیئر کا نام بھی نوع انسان کے عظیم ترین مفکرین کی فہرست میں شامل ہے؛ وہ احتجاج کریں گے کہ اس کی فکر اچھوتی ہونے کے بجائے مستعار لی ہوئی تھی، اور اس کا اثر غیر اخلاقی اور تباہ کن تھا۔ لیکن ہم میں سے اچھوتا کون ہے، ماسوائے ہیئت کے؟ آج ہم کونسا ایسا تصور کر سکتے ہیں جس کا پہلے ہی کسی نہ کسی صورت میں لطف نہ اٹھایا جا چکا ہو؟ صداقت کی نسبت خطا کاری میں اچھوتا ہونا زیادہ آسان ہے، کیونکہ ہر صداقت ایک ہزار ہرزہ سرائیوں کو بے دخل کرتی ہے۔ کوئی ایمان دار فلسفی سانتیانا جارج کی طرح تسلیم کرے گا کہ صداقت کے خدوخال ارسطو جتنے ہی پرانے ہیں اور آج ہمیں بس اپنی عاجلانہ ضروریات کے مطابق تھوڑی بہت ترمیم لانے کی ہی ضرورت ہے۔ کیا جدید مفکرین میں سے عمیق ترین سپنوزا نے اپنی فکر کے اساسی اجزا برونو، میمونائیڈز اور ڈیکارٹ سے مستعار نہیں لیے تھے؟ کیا رامیوس نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے کے لیے اس اوسط قسم کے قضیے کا دفاع نہیں کیا تھا کہ ارسطو کے ہاں افلاطون سے اچکی ہوئی چیزوں کے سوا سب کچھ مصنوعی ہے؟ اور کیا شیکسپیئر کی طرح افلاطون نے بھی ہر طرف سے چیزیں مستعار لے کر اس مال مسروقہ کو اپنے سے حسین انداز میں نہیں ڈھالا تھا؟ چلیے مان لیتے ہیں کہ بیکن کی طرح وولٹیئر نے بھی "اپنی شمع ہر آدمی کی مشعل سے آگ لے کر جلائی تھی؛" مگر اس کے باوجود اُس نے مشعل کی روشنی کو اس قدر تیز کر دیا کہ ساری نوع انسان منور ہو گئی۔ اسے چیزیں مدھم حالت میں ملیں اور اُس نے انہیں ضوفشاں بنا دیا؛ اسے ابہام ملا، اور اس نے اسے صراحت سے معمور کیا؛ اسے ملنے والی چیزیں بے کار متکلمانہ لبادے میں تھیں، اور اُس نے انہیں ایسی زبان عطا کی کہ ساری دنیا انہیں سمجھنے اور مستفید ہونے کے قابل ہو سکی۔ واحد آدمی نے کبھی اتنے بہت سے انسانوں کو تعلیم نہیں دی تھی یا اس قدر نا قابل مدافعت فنکاری نہیں دکھائی تھی۔

کیا اس کا اثر تباہ کن تھا؟ کون کہتا ہے؟ کیا ہم اپنی اختیار کردہ معروضیت کو ترک کر کے Ferney کے خندہ زن فلسفی کو اس لیے مسترد کر دیں کیونکہ اس کی فکر ہماری اپنی فکر سے مختلف تھی؟ لیکن یہاں ہم نے سپنوزا کی قربانی دی ہے، چاہے ہم میں سے کچھ لوگوں نے اس کے فلسفے پر عہد

لے رکھا ہے۔ ہم نے اُسے اس لیے قربان کیا کیونکہ اُس کا عمیق ہوتے ہوئے بھی بہت محدود حلقے تک ہی رہا۔ بلاشبہ ہمیں وولٹیئر کے بارے میں پوچھا پڑے گا کہ ہم تو اس کے اخذ کردہ نتائج قبول نہیں کرتے، مگر خود اُس نے انہیں قبول کیا تھا، کیا اس کی فکر نے اپنے عہد اور آئندہ نسلوں کی تعلیم یافتہ انسانیت کی صورت گری کی؟

جی ہاں، اس نے صورت گری کی۔ اس بارے میں شک کی گنجائش بہت کم ہے۔ لوئس XVI نے اپنی Temple جیل میں وولٹیئر اور روسو کی تحریروں کو دیکھتے ہوئے کہا تھا، ''ان دو آدمیوں نے فرانس کو (یعنی استبدادیت) تباہ کر دیا۔'' شاید بے چارے بادشاہ نے فلسفے کو بہت زیادہ عزت دیدی؛ بلاشبہ وولٹیئر پر مرکوز عقلی شورش کی تہ میں اقتصادی وجوہ موجود تھیں۔ لیکن جس طرح جسمانی انحطاط اُس وقت تک کسی عمل تک نہیں لیجا تا جب تک یہ شعور کو تکلیف کا پیغام نہ بھیج دے، چنانچہ اگر سینکڑوں جان دار قلم صورت حال کو ملک کے ضمیر اور شعور تک نہ پہنچاتے تو بوربون فرانس کا اقتصادی اور سیاسی بگاڑ آگے چل کر قطعی قومی انتشار پر منتج ہوسکتا تھا۔ اور اس کارِ عظیم میں وولٹیئر کمانڈر انچیف تھا؛ باقی سب نے اس کی قیادت بخوشی قبول کی اور اس کے حکم بجالائے۔ حتیٰ کہ طاقت ور فریڈرک نے بھی اس کا استقبال کرتے ہوئے اسے ''زمانوں بعد پیدا ہونے والا اعلیٰ ترین جینیئس'' قرار دیا۔

ہمارے گردو پیش میں قدیم عقائد کی تجدید کی تہ میں وولٹیئر کا اثر و رسوخ قائم و دائم ہے۔ جس طرح اُس کی صدی میں تمام یورپ اُس کے عصائے قلم کے آگے سرنگوں ہوا، اسی طرح بعد کی صدیوں میں ذہن کے عظیم قائدین نے اسے ہمارے عہد کی عقلی روشن خیالی کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ نٹشے نے اپنی ایک کتاب اس کے نام منسوب کی اور وولٹیئری چشمے سے جی بھر کر پیاس بجھائی؛ اناطولی فرانس نے اس عظیم ولی کی چھوڑی ہوئی 99 جلدوں کی بنیاد پر اپنی فکر، فراست اور انداز کی عمارت کھڑی کی؛ اور آزادی کی جنگ میں کئی لڑائیوں کے ضعیف غازی Brandes نے اپنی زندگی کے آخری چند سال ''Great Emancipator of Ferney'' کی صنم پرستانہ سوانح لکھنے میں صرف کیے۔

9-ایمانوئیل کانٹ :بایں ہمہ، سادہ عقیدے اور ایمان دارانہ شک کے درمیان اس ناگزیر تصادم کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ ان مسالک کے متعلق کہنے کو کچھ رہ گیا تھا جنہیں روشن خیالی نے بدیہی طور پر تباہ کر دیا۔ پھر بھی ایک ذاتی معبود پر خود وولٹیئر کا مخلصانہ اعتقاد قائم رہا، اور اس نے ''خدا کے لیے'' فرنی میں ایک چھوٹا سا گرجا خانہ بنوایا۔ لیکن اس کے پیروکار آگے نکل گئے اور اس کے مرنے پر مادیت پسندی نے ہر مقابل فلسفے کا تعاقب کیا۔

دنیا کا تجزیہ کرنے کے دو طریقے ہیں؛ ہم مادے سے آغاز کرتے ہیں، پھر ذہن کی تمام اسراریت اس میں سے مستنبط کرنے پر مجبور ہوتے ہیں؛ یا پھر ہم ذہن سے آغاز کرتے ہیں اور مادہ کو محض محسوسات کا ایک ڈھیر خیال کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہم مادے کو حسیات کے بغیر کس طرح جان سکتے ہیں؟ — اور یہ اپنے بارے میں ہمارے تصور کے سوا اور ہے بھی کیا؟ ہمیں معلوم مادہ محض ذہن کی ایک صورت ہے۔

جب برکلی نے پہلی مرتبہ واضح لفظوں میں دنیا کے اس انوکھے ماخذ کا اعلان کیا تو پنڈتوں میں جھرجھری دوڑ گئی اور یہ بات روشن خیالی کے ساتھ بے وفائی سے ایک شان دار خروج پیش کرتی معلوم ہوئی۔ یہاں ذہن کی اولیت منوانے، اس کے خطرہ بن کر منڈلاتے ہوئے دشمن کو اس کی اقلیم میں محض ایک علاقہ بنانے اور مذہبی اعتقاد ولافانی امید کی فلسفیانہ بنیادیں بحال کرنے کا ایک موقعہ تھا۔

اس مثالیت پسندانہ پیش رفت میں مطلق شخصیت ایمانوئیل کانٹ تھا، مجرد فلسفی کا کامل اولیں نمونہ؛ کانٹ نے کونگز برگ میں کافی سفر کیا اور اس کی گزرگاہوں میں چہل قدمی کرتے ہوئے ستاروں بھرے آسمانوں کو ایک نیم غیر حقیقی مظہر میں سیال ہوتے دیکھا اور ادراک کے ذریعے اسے ایک موضوعی چیز بنا کر رکھ دیا۔ یہ کانٹ ہی تھا جس نے ذہن کو مادے سے نجات دلانے کے لیے عرق ریزی کی؛ جس نے ''عقل محض'' کے استعمالات کے خلاف اس قدر ناقابل تردید (کیونکہ انہیں چھو کر نہیں دیکھا جا سکتا تھا) دلائل دیے؛ اور جس نے اپنی فکر کے کرتب سے قدیم عقیدے کے عزیز اعتقادات کو جادوگر کی طرح دوبارہ زندہ کر دیا۔

دنیا نے اس کی بات خوشی سے سنی، کیونکہ اسے محسوس ہوا کہ وہ صرف عقیدے کے تحت ہی زندہ رہ سکتی تھی، اور ایسی سائنس سے محبت نہیں کرتی تھی جس نے اس کی امنگوں اور امیدوں کو خاک میں ملا دیا۔ ساری انیسویں صدی کے دوران کانٹ کا اثر بڑھتا رہا؛ گاہے بگاہے جب عقلیت اور تشکیکیت نے قدیم قلعوں کے لیے خطرہ پیدا کیا تو انسان طاقت اور پناہ کے لیے ''واپس کانٹ کی جانب'' بھاگے۔ حتیٰ کہ شوپنہاور جیسے انسان اور نٹشے جیسے باولے اور ملحد نے بھی اسے قبول کیا اور اس طریقے کو سراہا جس کے ذریعے کانٹ نے دنیا کو محض ظاہری صورت بنا کر رکھ دیا اور ہر ممکنہ فلسفے کا بنیادی قضیہ طے کر دیا۔ کانٹ کا کام اس قدر جان دار تھا کہ یہ ہمارے عہد میں بھی اپنے خدو خال اور بنیادوں میں ویسا کا ویسا ہے؛ کیا سائنس نے خود بھی پیئرسن، ماخ اور Poincare کے توسط سے تسلیم نہیں کیا کہ تمام حقیقت، تمام ''مادہ،'' تمام ''فطرت'' اپنے ''قوانین سمیت،'' محض ذہن کی صناعی ہیں اور ان کی گریز اں صداقت کو جاننا ممکن تو ہے مگر قطعی طور پر کبھی نہیں جانا جا سکتا؟ بدیہی طور پر مادیت پسندی اور الحاد پرستی کے خلاف کانٹ نے یہ جنگ جیت لی تھی، اور دنیا دوبارہ امیدیں باندھ سکتی تھی۔

10- چارلس ڈارون: تب ڈارون کا ظہور ہوا اور جنگ نئے سرے سے چھڑ گئی۔ آج ہم یہ جاننے سے قاصر ہیں کہ انجام کار نوع انسانی کی تاریخ میں ڈارون کے کام کا کیا مفہوم ہوگا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ آنے والی نسلوں کے لیے اس کا نام مغربی تہذیب کی عقلی ترقی میں ایک اہم موڑ کی نمائندگی کرتا رہے گا۔ اگر ڈارون غلط تھا تو دنیا اسے بالکل اسی طرح بھول سکتی ہے جیسے ڈیماکریٹس اور اناکساغورث کو بھول گئی؛ اگر وہ درست تھا تو انسانوں کو جدید فکر کا سن آغاز 1859ء کو قرار دینا پڑے گا۔

ڈارون نے خاموشی اور نہایت انکساری کے ساتھ دنیا کی ایک ایسی تصویر پیش کرنے کے علاوہ اور کیا کیا تھا جو ماضی کے انسانوں کو مطمئن کرتی آئی تھی؟ ہم نے فرض کر لیا تھا کہ دنیا ایک ضابطے کے تحت الوہی راہنمائی اور قادر مطلق ذہانت کے مطابق کامل انداز میں حرکت کرتی تھی

جس میں ہر اچھائی انجام کار موزوں انعام پاتی تھی۔ لیکن ڈارون نے کسی بھی عقیدے پر حملہ کیے بغیر اپنے مشاہدہ کردہ امور بیان کیے۔ اچانک دنیا غصے کے مارے سرخ ہو گئی اور خزاں کی دھوپ میں خوب صورت رنگ بکھیرنے والی فطرت محض قتل و غارت کا ایک منظر پیش کرنے لگی جس میں پیدائش ایک حادثہ اور واحد قطعیت موت تھی۔ ''فطرت'' کا نام ''فطری انتخاب'' ہو گیا، یعنی جہد للبقا؛ اور یہ جہد صرف بقا کے لیے ہی نہیں بلکہ جفتی اور طاقت کے لیے بھی تھی، ایسے نرم و نازک پھولوں اور خوش خصلت جانوروں اور مہربان انسانوں کا بے رحمانہ خاتمہ جو ''غیر موزوں'' تھے۔ روئے ارض متحارب انواع اور مقابلہ آرا افراد سے بھری پڑی تھی، ہر نامیاتی جسم کسی زیادہ بڑے درندے کا شکار ہوتا تھا؛ ہر زندگی کسی اور زندگی کو کام میں لانے کے ذریعے ممکن تھی؛ عظیم ''فطری'' آفات واقع ہوئیں، برفیلے دور، زلزلے، تارنیڈو، قحط، ٹڈی دل، خشک سالیاں، جنگیں، کروڑوں جان داروں کا قلع قمع ہو گیا، یکا یک یا دھیرے دھیرے مارے گئے۔ کچھ انواع اور کچھ افراد نے تھوڑا عرصہ خود کو قائم رکھا — یہ ارتقا تھا۔ یہ فطرت تھی، یہ حقیقت تھی۔

کاپرنیکس نے کرۂ ارض کو محض اڑتے بادلوں کے درمیان ایک ذرہ بنا کر رکھ دیا تھا؛ ڈارون نے انسان کی اہمیت گھٹا کر محض ایک جانور جیسی کر دی جو کرۂ ارض پر اپنی لمحاتی حاکمیت کے لیے برسرِ پیکار تھا۔ انسان اب خدا کا بیٹا نہ رہا؛ وہ افتراق کی اولاد تھا، اور اس کی جنگوں نے خوفناک ترین ظالموں کو بھی شرمندہ کر دیا۔ نسل انسانی اب ایک مہربان معبود کی پسندیدہ تخلیق نہیں رہی تھی؛ یہ بوزنے کی ایک نوع تھی جسے تغیر اور انتخاب کی مہربانیوں نے ایک متزلزل عظمت سے ہم کنار کر دیا تھا، اور جس کے اپنے مقدر میں بھی مغلوب اور معدوم ہونا لکھا تھا۔ انسان لافانی نہیں تھا؛ عین پیدائش کے لمحے میں اُس پر موت کی لعنت ڈال دی جاتی۔

ذرا تصور کریں کہ ہمارے عہد جوانی کے مہربان فلسفے میں پرورش پانے والے اذہان پر کتنا دباؤ پڑا، اور وہ ڈارونی دنیا کی درشت اور خونیں تصویر کی عادت ڈالنے پر مجبور ہوئے۔ کیا قدیم عقیدے کا اپنی بقا کے لیے لڑائی لڑنا کوئی حیرت انگیز بات تھی؟ ایک پشت تک ''سائنس اور مذہب کے درمیان تصادم'' اُس موقعے پر ہونے والے تصادم سے زیادہ شدید رہا جب گلیلیو نے توبہ کر لی

اور برونو کو زندہ جلا دیا گیا۔ اور کیا آج محاذ آرائی سے تھک چکے فاتحین باقیات کے درمیان فسردگی سے بیٹھے دل ہی دل میں اپنی نصرت پر گریہ کناں نہیں اور اپنی فتح کے باعث تباہ شدہ پرانی دنیا کی ہی تمنا نہیں کرتے؟

اعتذار

تو یہ تھے ہمارے دس مفکر۔ آیئے ان پر دوبارہ ایک نظر ڈالیں:

1-کنفیوشس

2-افلاطون

3-ارسطو

4-سینٹ تھامس آکوئینس

5-کاپرنیکس

6-سر فرانسس بیکن

7-سر آئزک نیوٹن

8-وولٹیئر

9-ایمانوئیل کانٹ

10-چارلس ڈارون

فہرست میں شامل نہ کیے افراد کی بھی ایک پوری فہرست ہے: ڈیماکریٹس، اپی قورس، مارکس آریلیئس، ایبے لارڈ، گلیلیو، سپینوزا، لیبنز، شوپنہاور، سپنسر، نٹشے۔ اور ان وسیع وعریض فکری تحریکوں پر غور کریں جنہیں ہم نظر انداز کر گئے — مثلاً نسوانیت پسندی جس کی عظیم قائدین میں میری وولسٹون کرافٹ سے لے کر سوسن انتھونی تک شامل ہیں؛ سوشلزم، جس سے وابستہ پرامید نظریہ دانوں کی لمبی فہرست ہے، ڈایوجینز اور زینو سے لے کر لاسال اور مارکس تک۔ ایسا ہونا ناگزیر

ہے؛ کوئی بھی فہرست انسانی ورثے کے خزانے کا احاطہ یا اس کے لامحدود تنوع کی ہم سری نہیں کر سکتی۔ اور یہ اچھا ہی ہے؛ متعدد فہرستیں اور متعدد ہیروز رکھنے میں کوئی حرج نہیں؛ ہم ان کی بے جا تعظیم یا ان کی یاد منانے میں مبالغہ نہیں کر سکتے۔

شاید اولیا کی حقیقی دعا اسی میں مضمر ہے: ایسے نام موجود ہیں جنہیں ہمارے کیلنڈروں کی زینت بننا چاہیے، جنہوں نے دنیا کو نیا حسن ودیعت کیا، یا اسے زیادہ کریم انسانیت تک پہنچایا۔

باب3

دس ''عظیم ترین'' شاعر

میں اس وقت تک آگے بڑھنے کی جرات نہیں کروں گا جب تک اُس سوال سے دو دو ہاتھ نہ کرلوں جو ہر منطق پسند نے ہماری جستجو شروع ہونے سے قبل پوچھا ہوگا: ''کسی شاعر کی عظمت جانچنے کے لیے آپ کے پاس کیا معیار ہے؟'' یہ ایک افسوس ناک الجھن ہے۔ کیونکہ اگر میں اپنی ذاتی پسند اور ذوق سے بالاتر ہوکر کوئی معروضی کسوٹی منتخب کروں تو ہم ایڈونچر اور خوش گوار دھچکے کا جوش کھو دیں گے جو انفرادی ترجیح کے سامنے بخوشی سرِ تسلیم خم کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اور واحد معروضی کسوٹی شہرت یا اثر ہے، لیکن یہ معیار (جو عظیم ترین مفکرین کا انتخاب کرتے وقت باوثوق معلوم ہوتا تھا) شاعروں کے معاملے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ موجودہ دور کے شعرا کو اثر یا شہرت کے لحاظ سے درجہ بند کرنے کا تصور کون کر سکتا ہے؟ کون ہے جو مشفق اور مترنم لانگ فیلو کو صرف اس لیے ہمارے عظیم ترین نغمہ گروں میں شامل کرے کہ بہت بڑی اکثریت والٹ وٹمین کی

لا پروا تکفیرات اور تجربات کو قبول کرنے کے بجائے اُسے زیادہ خوشی سے سُنتی ہے؟ نہیں؛ میں یہاں اپنے تعصبات منکشف کرنے سے زیادہ کچھ نہیں کرنا چاہتا؛ میں ان اشخاص کو ریکارڈ میں لانا چاہتا ہوں جنہوں نے مجھے باقی سب سے بڑھ کر موسیقی، جذبے، تمثیلیت اور سوچ کا انوکھا ملغوبہ مہیا کیا؛ اور یہ ملغوبہ ہی شاعری ہے۔

1-ھومر: میں نے برسوں پہلے روس میں شاعری کا ماخذ دیکھا۔ہم نے روسیوں کا مطالعہ ان کے گھروں اور فطری ماحول میں کرنے کا عزم کیا تھا، اور ہم ہفتہ بھر کے لیے کسانوں کے ایک میلے میں ٹھہرے، اور چرنیکوف میں واقع اپنے گائیڈ کے isba (لکڑی سے بنا ہوا روسی جھونپڑا) میں قیام کیا۔پہلی رات کو ہی دیہاتیوں نے ہمیں شک کی نظر سے دیکھا؛ چند افراد نے ڈرتے ڈرتے اعلان کیا کہ ہم ان کے بچوں کو اغوا کرنے آئے تھے۔لیکن دوسری رات کو وہ ہمارے جھونپڑے کے باہر جمع ہو گئے اور کھلی فضا میں رقص وسنگیت کی محفل سجائی۔ہم بنچوں یا گھاس پر بیٹھتے ہوئے تھے کہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھے ایک بوڑھے، باریش اور نابینا مخمص نے اپنے بیلا لائکا (balalaika) کے تاروں کو چھیڑا اور اپنی نسل کی قدیم داستانیں سنانے لگا۔انداز بیان پر ملال تھا، ہر مرتبہ اس کا اختتام ایک دھیمے سُر پر ہوتا جو کہانی کو بہت آرام سے آگے بڑھاتا، کہ جیسے کسی گھومتے ہوئے عظیم پہیے کی حرکت کا زور اسے ایک اور چکر دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔اور وہ داستانیں سنتے ہوئے میں نے ہومر کو اہل یونان کے لیے ''ٹرائے کی شکست'' گاتے ہوئے دیکھا۔

اس سادہ اور مترنم انداز میں، حافظے کے مددگار سُر تال کے ساتھ انسان نے تحریر کے وجود میں آنے سے قبل اپنی تاریخ کو منتقل اور مزین کیا۔دیوتاؤں کے زمانے میں تاریخ شاعری کے شایانِ شان تھی؛ انسانی محبت اور جنگ کی کہانی، دیوتاؤں کی شرکت سے افلا کی چکا چوند کی حامل، بہت سے سفری گویوں کی مجموعی کاوشوں کے باعث رفعت پا کر رزمیہ داستانوں کے درجے تک سرفراز ہوئی جنہیں آج ہم ''ایلیڈ'' اور ''اوڈیسی'' کے نام سے جانتے ہیں۔

ہومر غالباً اُن گویوں میں سے ایک تھا جنہوں نے یادآوری کے یہ قصے ترتیب دیے، کیونکہ

وحدت ہمارے لیے باعث سہولت ہے اور ہم صداقت کے حصے بخرے کرنا پسند نہیں کرتے۔ ہر قوم کے ادب کا آغاز اسی قسم کی رزمیہ داستانوں، ویدوں یا کہانیوں سے ہوتا ہے — رامائن، مہابھارت، Nibelungenlieds، بیوولف، یا شانسوں ڈی رولاں؛ افراد کے بچپن کی طرح یہ بھی اقوام کے بچپن میں فطری ہیں؛ انہوں نے اُن وطن پرستانہ تواریخ کی جگہ لے لی جن میں ہر ملک ہمیشہ راستی پر ہوتا ہے، ہر لڑائی جیتتا ہے اور خدا کا مقربِ خاص ہوتا ہے۔

ہومر کی بیان کردہ کہانی جیسی کسی بھی کہانی کا سچا ہونا یا نہ ہونا غیر اہم اور غیر ضروری ہے؛ ہمیں اس بات سے غرض نہیں کہ اس کے مرد وخواتین — اور حتیٰ کہ کچھ معبود — بدیہی طور پر اس کے ارفع تخیل کی پیداوار ہیں۔ اس نے اتنی اعلیٰ ایجادات کیں اور ان کے متعلق اتنے واضح انداز میں بتایا کہ اگر حقائق مختلف تھے تو اس میں حقائق کا ہی نقصان ہے۔ صداقت کے ساتھ ساتھ حسن بھی اپنے حقوق رکھتا ہے؛ اور ''ایلیڈ'' ٹروجن جنگ کی نسبت زیادہ اہم ہے۔ چلیں مان لیتے ہیں کہ ہیلن محض ایک نام یا تحریک انگیز سفارتی جملہ تھی، اور مصروفِ پیکار یونانیوں کا اصل مقصد ایک خوب صورت لذت حاصل کرنے کے بجائے عسکری لحاظ سے اہم بندرگاہ تھی؛ اس کے باوجود سات ٹرائے زیرِ زمین مدفون پڑے ہیں، جبکہ ہیلن کا نام خوب صورتی کا لافانی ہم معنی بن گیا ہے اور اس میں اب بھی اتنی طاقت ہے کہ روشنائی کے عظیم ترین بحر کو لاکھوں کتب پر پھیلا سکتا ہے۔

اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ قدیم داستانیں آرٹ یا فکر سے لبریز نہیں؛ وہ ذہن کے بجائے سماعت اور دقیق النظر آقاؤں کے بجائے عوام کے لیے تھیں؛ ان کا سنتے ہی سمجھ میں آجانا ضروری تھا، اور انہیں زوردار عمل کے ساتھ آگے پہنچنا چاہیے تھا۔ آج ہم ژولیدہ اور اکثر اندر کی جانب مائل زندگیاں گزارتے ہیں اور اہل یونان جیسا ایکشن شاذ ونادر ہی واقع ہوتا ہے؛ ہم زیادہ تر ایکشن پریس میں ہی دیکھتے ہیں؛ انسان اب ایسا جانور بن گیا ہے جو رک جاتا اور سوچتا ہے۔ چنانچہ ہمارا ادب امنگوں اور فکر کا ایک تجزیہ ہے؛ ہم ذہنی تضاد میں ہی عمیق ترین جنگیں اور تاریک ترین المناکیاں پاتے ہیں۔ لیکن ہومر کے زمانے میں زندگی ایکشن تھی، اور ہومر ایکشن کا پیغام بر تھا۔ اس کی شاعری اور اندازِ بیان کافی حد تک ایکشن کے تابع ہیں؛ اس کی متلاطم مسدس کہانی کسی

چوڑی اور پرزور دریا کی طرح چلتی ہے؛ لہٰذا (کم از کم جب ہم سورماؤں اور دیوتاؤں کے شجرۂ نسب سے آگاہ ہیں) ہم یوں نظم کی گرفت میں آجاتے ہیں جیسے کسی تیز رو نیاگرا میں بہہ رہے ہوں۔ پھر بھی اس تمام لڑائی بھڑائی کے عین درمیان میں پرسکون شاعری ابھرتی ہے جس کا یہاں ایک چھوٹا سا اقتباس دینا برمحل ہوگا:

ہیکٹر نے ان سے پرجوش خطاب کیا
اور اہلِ ٹروجن نے شور مچا کر داد دی؛
تب اُنہوں نے اپنے جنگی گھوڑے کھول دیے،
اور ہر ایک نے اپنے گھوڑوں کی لگام رتھ سے باندھ دی۔
اور پھر وہ جلدی جلدی شہر سے جا کر لائے،
بیل اور فربہ بھیڑیں، اور میٹھی شراب......
انہوں نے جلانے کی فالتو لکڑی اکٹھی کی؛ اور پھر
ہواؤں کے دوش پر میدانوں سے آسمانوں تک
ایک مہک پھیل گئی اور وہ جنگ کی شاہراہوں پر
ساری رات پرامید بیٹھے رہے،
اور ان میں سے متعدد الاؤ کو جلتے دیکھتے رہے۔
حتیٰ کہ جب گنبدِ فلک پر ستارے چمکنے لگے
اور ہوائیں سرسرانے لگیں،
اور چوٹیاں اور کھلیان سر اٹھانے لگے، اور
کھیت ظاہر ہوئے اور عالیشان آسمان محیط ہو گیا
اور ستاروں کا ہجوم جل اٹھا، تو
تھکے ماندے گڈریے کا دل چہک اٹھا۔
دریں اثنا جنگ کی تھکاوٹ سے چور گھوڑے چرتے رہے،
اپنے رتھوں کے نزدیک،
اور سنہری تخت والی سحر کا انتظار کرتے رہے۔

(VIII، اختتامیہ)

2-داؤد: دوسرے نمبر میں نے ''زبوری'' کو رکھا ہے۔ ہمیں اس کے متعلق بس اتنا ہی معلوم ہے کہ وہ جو کوئی بھی تھا مگر داؤد نہیں تھا۔ داؤد ایک گروہ کا سرغنہ تھا، ڈاکہ زنی کے ذریعے امیر ہو گیا، ساؤل کا تخت چھینا، دوسرے لوگوں کی بیویاں بھگائیں، ہر حکم کو توڑا، اور آنے والی نسلوں نے اسے زبور کے پرہیز گار مصنف کے طور پر احترام دیا۔ ''مدح کے گیت'' بہت سے لوگوں نے ترتیب دیے، مگر ان لوگوں میں داؤد ہرگز شامل نہیں تھا؛ وہ صدیوں کے دوران یروشلم کے معبد میں آنے والے پجاریوں نے اکٹھے کیے؛ اور انہیں مسیح کے 150 سال بعد ہی ایک جگہ اکٹھا کیا گیا جب داؤد کو گزرے ایک ہزار سال سے زائد عرصہ ہو چکا تھا۔

اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ انہیں کس نے اور کب لکھا تھا؛ وہ موجود تو ہیں، ادب میں عمیق ترین غنائیوں کی صورت میں، کیف سے اس قدر بھرپور کہ عقیدے پر شک کرنے والے لوگ آج بھی ان کی موسیقی سن کر اپنے خون میں عجیب سار دعمل محسوس کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ وہ نالہ و فریاد بہت زیادہ کرتے ہیں؛ کہ وہ ایوب کی اس حیرت کی بازگشت ہیں کہ غریب ذلت کا شکار اور ظالم لوگ سرفراز کیوں ہیں؛ کہ وہ نہایت جھگڑالو پن کے ساتھ دشمنوں کو سزا دیے جانے کی التجائیں کرتے ہیں؛ کہ وہ یہوواہ کی بے جا خوشامد کرتے، اس کی لاپروائی پر ملامت کرتے ہیں (XLIV:1، X)، اور عمومی تصویر میں یہودیوں اور زائرین کا خداوند زبردست اور خوفناک جنگ میں بطور سپہ سالار نظر آتا ہے (XII، 3، XVIII، 8، 34، 40، LXIV:7)۔

پھر بھی رزمیہ گیتوں کے درمیان عاجزی اور دکھ کے کیسے دل گداز گیت سنائی دیتے ہیں:

> انسان کی عمر تو خاک کے مانند ہے۔ وہ جنگلی پھول کی طرح کھلتا ہے کہ ہوا اس پر چلی اور وہ نہیں اور اس کی جگہ اسے پھر نہ دیکھے گی۔

مذہبی احساس کو کبھی بھی اس قدر زوردار یا اس قدر خوب صورت انداز میں بیان نہیں کیا گیا تھا؛ اس کے الفاظ میں عالی شان سُر دھڑکتے ہیں؛ اس کے جملے ہماری گفتگو کا حصہ بن گئے (''بچوں اور شیر خواروں کے منہ سے،'' ''میری آنکھ کا تارا،'' ''بادشاہوں پر کبھی بھروسا نہ کرو'')؛

اتنے بھرپور شوق اور تخیل کے ساتھ کہ مشرق بھی اس کا متحمل نہ ہو سکتا (اس نے آفتاب کے لیے ان میں خیمہ لگایا ہے جو دلہے کی مانند اپنے خلوت خانہ سے نکلتا ہے اور پہلوان کی طرح اپنی دوڑ میں دوڑنے کو خوش ہے'')۔ یہ آج تک لکھے گئے عمدہ ترین گیت ہیں، ناقابل پیمائش حد تک اثر انگیز؛ یہ دو ہزار سال سے انسان کو یوں گرما رہے ہیں کہ کسی اور محبت کے گیت نے نہ گرمایا ہوگا؛ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ یہ تکلیف زدہ یہودیوں اور امریکا جانے والے پہل کاروں کو قرار دیتے تھے۔ سب سے مشہور زبور کیسے ماں کی لوری کی طرح کیسے یقین اور طمانیت سے بھرپور ہے:

خداوند میرا چوپان ہے، مجھے کمی نہ ہوگی۔
وہ مجھے ہری ہری چراگاہوں میں بٹھاتا ہے۔
وہ مجھے راحت کے چشموں کے پاس لے جاتا ہے۔
وہ میری جان کو بحال کرتا ہے۔
وہ مجھے اپنے نام کی خاطر صداقت کی راہوں پر لے چلتا ہے،
بلکہ خواہ موت کے سایہ کی وادی میں سے میرا گزر ہو
میں کسی بلا سے نہیں ڈروں گا کیونکہ تو میرے ساتھ ہے۔
تیرے عصا اور تیری لاٹھی سے مجھے تسلی ہے۔
تو میرے دشمنوں کے روبرو میرے آگے دسترخوان بچھاتا ہے۔
تو نے میرے سر پہ تیل ملا ہے۔ میرا پیالہ لبریز ہوتا ہے۔
یقیناً بھلائی اور رحمت عمر بھر میرے ساتھ ساتھ رہیں گی۔
اور میں ہمیشہ خداوند کے گھر میں سکونت کروں گا۔

3-یوری پیڈیز :اب ہم واپس یونان پہنچتے ہیں، ہم ڈایونی سیئس کے تھیئٹر میں بیٹھے ہیں، یوری پیڈیز کا کھیل دیکھنے کے لیے تیار۔ پتھر کے نیم دائروں میں قطار در قطار نشستیں پہاڑ کے اوپر کی طرف جاتے ہوئے کشادہ ہوتی جاتی ہیں؛ پہاڑ کی چوٹی پر پارتھینون واقع ہے۔ نشستوں پر تیس

ہزار اہل ایتھنز بیٹھے بے قراری سے منتظر ہیں؛ کھلی عباؤں میں ملبوس، پرشوق، باتونی مرد، احساسات اور تصورات سے دھڑکتے ہوئے؛ اس قدر شوقین سامعین کبھی کسی شاعر کو سننے یا کھیل دیکھنے نہیں آئے تھے۔ نیچے اگلی قطار میں تراشے ہوئے اور مزئین ماربل کی کرسیوں پر شہر کے حکام اور السناک دیوتا کے پجاری براجمان ہیں۔ عظیم ایمفی تھیٹر کے مرکز میں ایک چھوٹا سا سٹیج ہے؛ اس کے پیچھے اداکاروں کا بوتھ ''skene'' یا سین ہے۔ اس کے اوپر آسمان اور اٹل سورج کے سوا کچھ بھی نہیں۔ بہت نیچے، پہاڑی کے دامن میں نیلگوں ایجیائی سمندر مسکرا رہا ہے۔

یہ سن 415 قبل مسیح ہے۔ ایتھنز پیلوپونیشیائی جنگ میں الجھا ہوا ہے، یونانیوں سے یونانیوں کی جنگ، رشتہ داروں کی باہمی غضب ناکی سے بھرپور۔ سنگ دل ڈرامہ نگار نے ایک اور جنگ، ٹرائے کا محاصرہ، کو موضوع بنایا ہے، اور اس کے دوستوں (جن میں سقراط بھی شامل تھا، جو یوری پیڈیز کے کھیل دیکھنے جایا کرتا تھا) نے سرگوشی کی کہ یہ کھیل ہومر کا الٹ ہوگا اور ٹروجن جنگ کو شکست خوردہ اور تباہ شدہ لوگوں کی نظر سے پیش کرے گا۔ اچانک خاموشی چھا گئی: اداکاروں کے بوتھ سے ایک شبیہ ابھری، سمندر کے دیوتا پوسیڈون سے مشابہ؛ وہ اونچے جوتوں کے ذریعے اوپر اٹھا ہوا ہے، اور موسیقی کی سنگت پر بولتا ہے:

تم اندھے کیسے ہو گئے،

اے شہروں کو روندنے والو، معبدوں کو اجاڑنے والو،

اور مقبروں، قدما کی قبروں کو رگیدنے والو؛

جلد ہی تم بھی مر جاؤ گے۔

(کیا یہی ابتدائی بول تھے جن پر [کہانی کے مطابق] سقراط نے اتنی دیر تک تالیاں بجائیں کہ اداکار دوبارہ ادائیگی پر مجبور ہو گیا؟)

یونانیوں نے ہیکٹر کو قتل کر کے ٹرائے پر قبضہ کر لیا ہے؛ اور Talthybius ہیکٹر کی بیوی آندروما کی، اس کی بہن پرغرور کاہنہ کیسانڈرا ماں سفید بالوں والی ملکہ ہیکو با کو لینے آتا ہے تا کہ وہ اہل یونان کی غلامی اور خدمت کریں۔ ہیکو با سر پیٹ لیتی اور گریہ کرتی ہے:

بے تاج سر کو مارو پیٹو،

رخساروں پر تھپڑ مارو یہاں تک کہ آنسو سرخ ہو جائیں!

ایک جھوٹا اور بے رحم آدمی

میرا آقا ہوگا......

آہ، میں پرانی باتیں یاد کروں گی،

اور ان کے گیت بُنوں گی......

اے سب سے گہرے گھاؤ والے،

جس نے میرے بچوں کو پکڑ رکھا ہے،

پریام، پریام، اے ضعیف العمر بادشاہ،

مجھے بھی اپنے پاس سُلا لے۔

آندروما کی خودکشی کا مشورہ دیتے ہوئے اس کی ڈھارس بندھانے کی کوشش کرتی ہے:

او گریہ کناں ماں، خوف پر فتح پانے والی بات سن

یہاں تک کہ تیرا دل بھی میری طرح ساکت ہو جائے۔

موت کا مطلب صرف موجود نہ ہونا ہے......

اور میں—میں نے ایک عرصے سے

نیک نامی کے قلب پر کمان کھینچ رکھی ہے

اور میں جانتی ہوں کے میرا تیر نشانے پر لگتا ہے؛

اور اسی لیے میں زیادہ بے سکون ہوں۔

مرد اسی لیے ہماری ستائش کرتے ہیں

میں نے ہیکٹر کی خاطر محبت کی اور فتح چاہی،

مجھے معلوم تھا کہ ہمیشہ اس میں دکھ ہوتا ہے،

یا قطعی معصومیت میں آوارہ پھرنا عورتوں کے لیے باعث بدنامی ہے؛

چنانچہ میں نے خواہش کو قدموں تلے روند ڈالا،

اور اپنے باغ میں راہداری پر چلتی گئی۔

عورتوں کی نرم باتیں کبھی میرے در میں داخل نہیں ہوئیں

میرے اپنے دل کے خیالات — مجھے اور کوئی خواہش نہیں —

مجھ سے گویا ہوتے تھے اور میں مسرور تھی۔

میں خاموش رہی اور آنکھوں کو متلاطم نہ ہونے دیا

اور زندوں کو دیکھتی رہی......

او میرے ہیکٹر، بہترین محبوب،

تو میرا تھا، سرتاپا میرا،

میرے بادشاہ، میرے دانا، او میرے شجاع!

آج تک کسی مرد کالمس بھی مجھے نہیں چھوا،

جب تو مجھے میرے باپ کے گھر سے لے گیا

اور مجھے اپنا بنایا......اور تو مر چکا ہے،

اور میں جنگ زدہ باندی بنالی گئی ہوں

اور مجھے کھارے سمندروں پر ندامت کی روٹی ملتی ہے!

ہیکوبا اس کی بات کو ناپسند کرتی اور امید ظاہر کرتی ہے کہ ہیکٹر کا بچہ استیاناکس شاید کسی روز شکست خوردہ شہر کو بحال کر دے۔ لیکن اس لمحے Talthybius واپس آ کر بتاتا ہے کہ اہل یونان کی مجلس نے Hellas کی حفاظت کے پیش نظر فیصلہ کیا ہے کہ ٹرائے شہر کی فصیل پر استیاناکس کی کھال کھنچوادی جائے۔ آندروما کی بچے کو اپنی بانہوں میں لے کر الوداع کہتی ہے:

میرے ننھے،

جو میری بانہوں میں لیٹا ہوا ہے،

تیری گردن سے کیسی میٹھی مہکاریں چھٹی ہیں،

میرے پیارے، کیا ایسا نہیں ہوسکتا ہے کہ تو اسی چھاتی سے لگا رہے،

کہ میں تیرا خیال رکھوں اور بیماری میں تیری تیمارداری کروں،

یہاں تک کہ تجھے تکتے تکتے مرجاؤں؟

مجھے بوسہ دے، بس ایک بار بوسہ دے؛

پھر کبھی نہ دینا، اپنی بازو میری گردن میں ڈال؛

مجھے بوسہ دے، ہونٹوں پر بوسہ......

اوہ، تجھے وہ غضب ملا ہے کہ جو مشرق کی تمام اذیتوں کو نیچا دکھاتا ہے۔

جلدی کرو، اسے لے جاؤ، اسے گھسیٹو، دیوار پر چڑھادو،

اسے چیر پھاڑ ڈالو، درندو، جلدی کرو!

خدا نے میرا کام تمام کردیا،

میں اپنے بچے کو موت سے بچانے کے لیے ہاتھ بھی نہیں اٹھا سکتی۔

مینی لاس ہیلن کی تلاش میں آتا اور اسے نظر آتے ہی مار ڈالنے کا عہد کرتا ہے؛ لیکن جب وہ فخر سے سر اٹھائے اور بلاخوف ظاہر ہوتی ہے، عورتوں کے درمیان دیوی کی طرح، تو وہ اس کے حسن کے نشے میں مست ہو جاتا ہے، اسے قتل کرنا بھول جاتا اور غلاموں کو حکم دیتا ہے کہ اسے ''کسی کمروں والی کشتی میں بٹھاؤ، جہاں وہ سمندروں پر سفر کر سکے۔'' تب Talthybius ہیکٹر کے بچے کا مردہ جسم اٹھائے واپس آتا ہے۔ ہیکوبا بچے کے ادھڑے ہوئے جسم کو تدفینی لباس میں لپیٹتی اور حقیقت پسندانہ جذبے سے بھرپور انداز میں بولتی ہے:

آہ، تجھے کیسی موت ملی، میرے ننھے!.....

تیری نرم بازو، وہی پیارا چہرہ،

اور خوب صورت ہونٹ، امید سے لبریز!

تو نے صبح کو کیا غلط الفاظ بولے تھے،

جب تو میرے بستر میں آن گھسا تھا،

مجھے برا بھلا کہا تھا اور وعدہ کیا تھا،

''دادی، جب تو مرے گی تو میں اپنے بال کٹوا دوں گا

اور تمام کپتانوں کو تیری قبر پر لاؤں گا۔''

تو نے میرے ساتھ یہ دھوکا کیوں کیا؟

ہائے، میں بوڑھی، بے گھر، بے اولاد

جو تیری جوان موت پر سرد آنسو بہاتی ہے۔

میرے خدا! تیرے پیروں کی مدھم چاپ،

میری گود میں کھیلنا اور میرے ساتھ لگ کر سونا!

سب کچھ چلا گیا۔

کوئی شاعر کیسے کتبہ لکھے گا جس میں یہ کہانی بیان ہو سکے؟

''یہاں ایک بچہ محوخواب ہے جس سے اہل یونان کو خوف تھا،

اور اسی لیے انہوں نے اسے مار ڈالا''

ہائے، یونان اس کہانی کا مشکور ہوگا!......

حیف ہے اس انسان پر

جو مسرت کا جشن مناتا ہے اور کوئی خوف نہیں کھاتا؛

جبکہ سالوں کے اتفاقات دیوانے کی طرح جھومتے رہتے ہیں!

(وہ بچے کو تدفینی لباس میں لپیٹتی ہے)

فریجیائی لباس کیسا شاندار ہے،

جو میں نے تیری دلہن کے لیے رکھا تھا،

اور مشرق کی کسی حسین ملکہ کا سوچتی تھی.....

میں ہمیشہ کے لیے تجھے اس میں سلاتی ہوں......

اور بربادی کے منظر پر کورس کے سُر دیوانہ وار گیت میں تیرتے ہیں:

اپنا سر پیٹو؛ گریہ وزاری کرو؛

مرنے والے کے لیے پیٹو اور خون بہاؤ،

میں مرنے والے کے لیے دکھی ہوں!

یہاں شیکسپیئر کی تمام قوت موجود ہے، اس کی وسعت اور لطافت کے بغیر، لیکن ایک سماجی جذبے کے ساتھ جو ہمیں ایسے دہلاتا ہے کہ کوئی جدید ڈرامہ کبھی نہیں دہلا سکا، ماسوائے موت گرفتہ کنگ لیئر کے۔ یہ آدمی اپنی بات کہنے کی طاقت، عین جنگی ہذیان کے دوران جنگ کا حیوانی پن دکھانے کی ہمت رکھتا ہے؛ وہ اتنا بہادر ہے کہ اہل یونان کو فتح کے عالم میں بطور وحشی اور ان کے دشمنوں کو بطور شکست خوردہ ہیروز پیش کر سکے۔ ''یوری پیڈیز انسان،'' غلامی کا استرداد، تنقید اور خواتین کا دفاع کرنے والا، تمام قطعیتوں پر شک اور تمام انسانوں سے محبت کرنے والا: کوئی شک نہیں کہ یونان کے نوجوان گلیوں بازاروں میں اس کے جملے بولتے پھرتے تھے اور قیدی بنائے گئے اہل ایتھنز نے اس کے کھیل زبانی سنا کر آزادی پائی۔ ڈرامہ نگار فلیمون نے کہا، ''اگر مجھے قطعی یقین ہوتا ہے کہ مردہ لوگ شعور رکھتے ہیں تو یوری پیڈیز سے ملنے کی خاطر پھانسی لے لیتا۔'' وہ سوفوکلیز والی کلاسیکی طمانیت اور معروضیت نہیں رکھتا تھا، نہ ہی ایسکائی لس والی سخت گیر رفعت کا حامل تھا؛ اس کا ان کے ساتھ وہی تعلق تھا جو جذباتی دستوئیفسکی کا بے نقص ترکیف اور دیو قامت ٹالسٹائی کے ساتھ تھا۔ لیکن ہمارے دل کے راز دستوئیفسکی کے ہاں ہی آشکار ہوتے اور ہم اپنی خفیہ خواہش کی تفہیم پاتے ہیں۔ اولمپس سے اکتا چکا یونانی ڈرامہ یوری پیڈیز کے ذریعے ہی زمین پر واپس آیا اور انسانوں کے معاملات پیش کیے۔ گوئٹے نے پوچھا تھا: ''کیا اس کے عہد کے بعد سے دنیا کی تمام اقوام نے کوئی ایک بھی ایسا ڈرامہ نگار پیدا کیا ہے جو یوری پیڈیز کے جوتے سیدھے کر سکے؟'' صرف ایک۔

4-لوکریٹئیس: چار صدیاں بیت گئیں۔ہم ایک پرانے اطالوی بنگلے میں ہیں جو میمیئس نامی کسی امیر شخص نے روم کے شوروغل سے کاری دور تعمیر کیا تھا۔مکان کے عقب میں ایک پرسکون صحن ہے، چاردیواری کے ذریعے دنیا سے الگ اور سورج کی تمازت سے سایہ فراہم کرنے والا۔ یہاں منظر خوب صورت ہے: دولڑکے مرمریں بنچ پر تالاب کنارے بیٹھے ہوئے، اور درمیان میں ان کا استاد بیٹھا ہے، سراسر شفقت ورحمت؛ وہ انہیں کوئی شاندار اور گونج دار نظم پڑھ کر سنا رہا ہے۔ آیئے باغیچے میں آگے اٹکر سنتے ہیں، کیونکہ یہ لوکریٹیئس ہے، روم کا عظیم ترین شاعر اور عظیم ترین فلسفی بھی۔ وہ کیا پڑھ رہا ہے؟ بقول پروفیسر Shotwell، تمام کلاسیکی ادب کا سب سے بڑا شاہکار'' ــــ ایک شعری مضمون De Rerüm Natura، ''چیزوں کی فطرت کے بارے میں۔'' وہ ایک apostrophe (خیالی شخص سے مکالمہ) پڑھ رہا ہے جس میں محبت کو تمام حیات اور تخلیق کا ماخذ قرار دیا گیا:

> اے وینس، تو چیزوں کی فطرت کی واحد محبوبہ ہے، اور تیرے بغیر زندگی کی الوہی اقالیم میں سے کچھ بھی ظہور پذیر نہ ہوتا، کوئی چیز نشوونما پا کر خوب صورت اور مسرور نہ ہوتی......تو تمام پہاڑوں اور سمندروں اور سرپٹ دوڑتے ہوئے دریاؤں اور پرندوں کے گھونسلوں اور لہلہاتی ہوئی گھاس کے میدانوں میں اور درندوں میں محبت جاگزیں کرتی ہے اور، تو اور ہر جانور کو کھولتی خواہش کے ذریعے اپنی نوع جاری رکھنے پر مائل کرتی ہے.....کیونکہ جب تک دن پر بہار جلوہ گر ہے، درندوں کا ریوڑ چراگاہوں میں چر رہا ہے، اور تیز ندیاں بہتی ہیں، ہر کوئی تیرے فسوں میں مقید اور تیری خواہش کا پیرو ہے۔

یہ لوکریٹیئس عجب آدمی ہے، واضح طور پر بدحواس اور متزلزل؛ کہانی کے مطابق ایک جوشاندۂ محبت نے اس کے جسم میں زہر پھیلا دیا اور اسے اکثر مالیخولیا اور دیوانگی کے دورے پڑتے تھے۔ وہ سراپا حساسیت، سرتاسر غرور، حالات کے ہر کانٹے سے زخمی ہے؛ ایسا آدمی جو امن کے لیے پیدا

ہوا، اور اسے سیزر کے خطرناک دور میں زندگی گزارنا پڑی؛ ایسا آدمی جو ایک باطنیت پسند اور ولی کا انداز رکھتا ہے، جس نے خود کو ایک مادیت پسند اور تشکیکیت پسند بنا لیا؛ ایک تنہائی پسند نفس، اپنی شرمساری کے ہاتھوں عزلت گزینی پر مائل، مگر دوستانے اور محبت کے لیے پر یقین۔ وہ ایک پرملال یاسیت پسند ہے، جو ہر طرف دو خود کو باطل کرتی ہوئی تحریکات دیکھتا ہے—نشو ونما اور انحطاط، تولید اور تباہی، زہرہ اور مریخ، حیات اور موت۔ تمام صورتوں کا آغاز اور انجام ہوتا ہے؛ صرف ایٹم، سپیس اور قانون باقی رہتا ہے؛ پیدائش بگاڑ کا دیباچہ ہے، اور حتیٰ کہ یہ مہیب کائنات بھی ٹھنڈی ہو کر واپس بے ہیئتی میں لوٹ جائے گی:

کسی بھی چیز کو ثبات نہیں، بلکہ سب کچھ متغیر ہے۔
جزو سے جزو چمٹتا ہے؛ چیزیں اسی طرح پھلتی پھولتی ہیں
یہاں تک کہ ہم انہیں جان لیتے اور ان کے نام رکھتے ہیں۔
آہستہ آہستہ وہ پگھل جاتی ہیں، اور ہمیں معلوم چیزیں نہیں رہ جاتیں۔
میں سست یا تیز رفتار ایٹموں میں گھرے
سورج دیکھتا ہوں، میں نظاموں کو ان کی صورت گری کرتے دیکھتا ہوں؛
حتیٰ کہ نظام اور ان کے سورج بھی آہستہ آہستہ واپس پلٹیں گے۔
اے کرۂ ارض، تو بھی—تیری بادشاہتیں، زمینیں اور سمندر—
تمام کہکشاؤں کے ستاروں کی طرح گھری ہوئی،
ان کی طرح تو بھی معدوم ہو جائے گی۔
ان کی طرح تو بھی ساعت بہ ساعت جا رہی ہے۔
کسی بھی چیز کو ثبات نہیں۔
تیرے لطیف دھند میں لپٹے سمندر ختم ہو جائیں گے؛
چاندنی سے چمکتی ریت اپنی جگہ چھوڑ دے گی؛

اور ان کی جگہ دوسرے سمندر لیں گے

اور ان پر دوسری آبناؤں کی سفیدی درانتی چلے گی۔

یہ ایک ملول فلسفہ ہے، یہ انسانوں کو مقدر کا سامنا کرنے کی خاطر ہمت دینے کے لیے وضع نہیں کیا گیا؛ یہ کہانی حیرت انگیز نہیں کہ لوکریٹیئس نے 41 سال کی عمر میں (55 ق م) خودکشی کر لی۔ ہماری نظر میں شاعر کا خلوص اس شاعری کو ترفع دیتا ہے اور زبردست بناتا ہے۔ البتہ اس کی لکھی ہوئی سطروں کی لاطینی ناپختہ ہے؛ ابھی ایک پشت کا عرصہ گزرنا ضروری تھا تاکہ سسرو کا بے کیف (اور ورجل کا محتاط) قلم رومنوں کی زبان کو صیقل کر کے پرآہنگ اور نفیس بناتا۔ لیکن عظیم خطیب کی سیال روانی، اور آگسٹس کے من پسند کی نسوانی خوب صورتی ان مردانہ مسدسوں، ان پر نظارہ اسم ہائے صفت میں رچی ہوئی ہے۔ انہیں سنتے ہوئے ہم اپی قورس کے باغ میں پہنچ جاتے ہیں، اور ڈیماکریٹس کی ہنسی کی دور سے آتی ہوئی آواز سنتے ہیں جو جانتا ہے کہ لوکریٹیئس کیا نہیں جانتا تھا: خوش روی دانش سے زیادہ بڑی عقل مندی ہے۔

5-لی-پو: چینی شہنشاہ منگ ہوانگ نے اپنے عہد عروج میں ایک روز کوریا سے آئے ہوئے سفیروں کو خوش آمدید کہا۔ یہ سفیر اپنے ساتھ اہم پیغامات لائے جن کا لہجہ اس کا کوئی بھی وزیر نہ سمجھ پایا۔ شہنشاہ نے کہا، ''کیا! اتنے بہت سے شہری ناظموں، اتنے سارے محققوں اور جنگجوؤں میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو ہمیں اس الجھن سے نکال سکتا ہو؟ اگر کوئی بھی تین دن کے اندر اندر اِس خط کا مفہوم معلوم نہ کر سکا تو سب کو معزول کر دیا جائے گا۔'' وزرا نے ایک دن باہم مشوروں اور کوششوں میں گزار دیا۔ انہیں اپنے عہدوں اور سروں سے محروم ہو جانے کا خوف لاحق تھا۔ تب وزیر ہو چی-چانگ تخت کے قریب آیا اور کہنے لگا: یہ خادم شہنشاہِ معظم کو اطلاع دینا چاہتا ہے کہ آپ کے گھرانے میں لی نامی ایک قابل شاعر موجود ہے جو ایک سے زائد علوم پر کامل دسترس رکھتا ہے؛ اسے خط پڑھنے کا حکم دیں، کیونکہ ایسا کوئی کام نہیں جو اس کے دست قدرت سے باہر ہو۔''

شہنشاہ نے لی کو فوراً دربار میں پیش ہونے کا حکم دیا، لیکن لی نے انکار کر دیا — اور کہا کہ غالباً وہ اس کام کے لائق نہیں، کیونکہ گزشتہ امتحانات میں مینڈرین نے اس کے انشائیے کو مسترد کر دیا تھا۔ شہنشاہ نے اس کی ڈھارس بندھانے کے لیے اسے اول درجے کے عالم کا خطاب اور لبادہ عطا کیا۔ لی آیا، اپنے ممتحنوں کو وزرا کے درمیان بیٹھے پایا، انہیں اپنے جوتے اتارنے پر مجبور کیا اور پھر دستاویزات کا ترجمہ کر دیا۔ ان میں اعلان کیا گیا تھا کہ کوریا اپنی آزادی کی بحالی کے لیے جنگ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ پیغام پڑھنے کے بعد اس نے ایک عالمانہ اور دہشت انگیز جواب لکھوایا اور شہنشاہ نے اس پر دستخط کیے۔ شہنشاہ لی کو آسمان سے اترا ہوا فرشتہ خیال کر رہا تھا۔ اہل کوریا نے خراج اور معافی نامہ بھجوایا، اور شہنشاہ نے خراج کا ایک حصہ لی کو دیا۔ لی نے یہ دولت سرائے دار کو دے دی کیونکہ وہ شراب کا رسیا تھا۔

چین کے کیٹس لی تائی پو نے دنیا کو 701ء میں دریافت کیا۔ اس نے ''بیس بہاریں بادلوں کے درمیان بسر کیں، تعیش کا شوقین اور پہاڑیوں پر فریفتہ رہا۔'' اس کی صحت اور طاقت خاصی اچھی ہو گئی، اور اس نے فنون محبت میں مشاقی پائی۔

انگوروں کی شراب\
سونے کے جام —\
اور ڈو کی حسین خادمہ۔\
وہ خچر پہ سوار آتی ہے؛ وہ پندرہ سال کی ہے؛\
نیلے رنگ سے بنائی ہوئی بھنویں —\
گلابی بروکیڈ کے پاپوش —\
نہایت دھیمی آواز —\
لیکن وہ غضب کا گاتی ہے۔\
سو، پھولوں کے خول سے جڑی میز پر\
ضیافت اڑاتے ہوئے،

وہ بادہ مست میری گود میں آن گری۔

آہ، میرے بچے، کیسا بوس و کنار

سوسن سے منقش پردوں کے پیچھے!

اور پھر انجام آرزو:

اے حسینہ، جب تو یہاں ہوتی تو میں

مکان کو پھولوں سے بھر دیتا۔

اے حسینہ، اب تو چلی گئی ہے،

بس ایک خالی دیوان باقی بچا ہے۔

دیوان پر ایک منقش رضائی تہ ہوئی پڑی ہے؛

مجھے نیند نہیں آتی۔

تجھے رخصت ہوئے تین برس بیت گئے۔

تیری چھوڑی ہوئی مہک مجھے باولا رہی ہے۔

تیری مہک مجھے اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے؛

لیکن میری محبوبہ، تو خود کہاں ہے؟

میں آہ بھرتا ہوں—زرد پتے شاخ سے جھڑ گئے۔

میں روتا ہوں—سبز کائی پر شبنم جھلملاتی ہے۔

اس نے شادی کی مگر اتنا تھوڑا سا سونا کمایا کہ بیوی اپنے بچوں سمیت چھوڑ کر چلی گئی۔ لی-پو نے انگور سے اپنی ڈھارس بندھائی اور شہر شہر سفر کرتے ہوئے گیت گا کر پیٹ بھرا۔ نا وچنگ کی شراب کی تعریف سن کر وہ ایک مرتبہ وہاں گیا۔ یہ شہر اہل چین کے تین سو میل کی دوری پر تھا— یعنی نا قابل عبور فاصلہ۔ ہر کسی نے اسے چاہا، کیونکہ وہ قلاش لوگوں اور بادشاہوں دونوں سے ایک ہی جیسے فخریہ اور دوستانہ انداز میں بات کرتا تھا۔ دارالحکومت میں شہنشاہ اس کا دوست بن گیا، لیکن

اسے مطیع نہ بنا سکا۔ ساتھی شاعر تو-فُو کہتا ہے:

جہاں تک لی-پو کا معاملہ ہے،
تو اسے بھری ہوئی صراحی دو،
وہ ایک سو نظمیں لکھ ڈالے گا۔
وہ چانگ آن کے ایک کوچے میں
شراب کی دکان میں بیٹھا رہتا ہے؛
اور چاہے شہنشاہ بلاوے بھیجتا رہے،
مگر وہ شاہی بجرے پر سوار نہیں ہو گا۔
وہ کہتا ہے، ''شہنشاہ معظم، میں شراب کا دیوتا ہوں۔''

اس نے لیو ہنگ کا فلسفہ قبول کیا جو ہر وقت اپنے ساتھ دو ملازم رکھنا چاہتا تھا، ایک شراب بردار اور دوسرا ایک بیلچہ بردار تا کہ وہ جہاں پر گرے وہیں دفنا دے؛ کیونکہ لیو نے کہا تھا ''اس دنیا کے معاملات دریا کی سطح پر تیرتے پودے سے زیادہ کچھ نہیں۔'' جلد ہی لی کو بھی ایسا ہی لگنے لگا، کیونکہ جب منگ ہوانگ محبت کی خاطر تخت سے ہاتھ دھو بیٹھا تو شاعر اپنے سرپرست سے محروم ہو گیا، اور چانگ آن سے فرار ہو کر دوبارہ دیہی علاقے میں آوارہ گردی کرنے لگا۔

میں سرسبز پہاڑوں کے درمیان کیوں رہتا ہوں؟
میں ہنستا ہوں اور جواب نہیں دیتا، میری روح متین ہے؛
یہ کسی اور آسمان اور بے ملکیت زمین میں رہتی ہے۔
آڑو کے اشجار ثمر بار ہیں، اور پانی رواں ہے۔

اس کے آخری برس بہت ترش تھے، کیونکہ اس نے دولت بنانے کی زحمت کبھی گوارا نہیں کی تھی، اور انقلاب و جنگ کی افراتفری میں کوئی ایسا بادشاہ نہ ملا جو اسے فاقے (شاعری کا فطری انعام) سے بچاتا۔ انجام کار، قید رہنے، موت کی سزا، معافی پانے اور ہر قسم کی صعوبت سہنے کے بعد

اسے آبائی گھر میں ٹھکانہ مل گیا، مگر تین سال بعد ہی موت نے آلیا۔ ایک غیر معمولی نفس کے لیے عام سی موت پر قناعت نہ کرنے والی روایت بتاتی ہے کہ کس طرح وہ پانی میں چاند کے عکس کو گلے لگانے کی کوشش کرتے ہوئے دریا میں ڈوب مرا۔

کیا ہم اس کے ایک اور گیت پر نظر ڈالتے چلیں؟

میری کشتی نرم لکڑی سے بنی ہے،
مغنی جڑاؤ بانسریاں اور طلائی نفیریاں لیے دونوں سروں پر بیٹھے ہیں۔
یہ کیسی مسرت ہے، میٹھی شراب کے ایک پیپے
اور گلوکاراؤں کی معیت میں۔
ہم لہروں کے ساتھ اِدھر اُدھر بہتے جاتے ہیں۔
میں ہوا کی پری سے زیادہ خوش ہوں، جو اپنے پیلے بگلے پہ سوار ہوتی ہے،
اور مرمین (بحری مخلوق) سے زیادہ آزاد ہوں
جو بگلوں کا بے مقصد تعاقب کرتی ہے۔
میں اپنے القائی قلم سے پانچ پہاڑوں کو دہلاتا ہوں۔
میری نظم مکمل ہوگئی، میں ہنستا ہوں، اور میری خوشی سمندر سے زیادہ وسیع ہے۔
آہ، لافانی شاعری! چوینگ کے گیت چاند اور سورج جیسے رفیع الشان ہیں۔
جبکہ چُو بادشاہوں کے محل اور منارے پہاڑیوں میں دفن ہوگئے ہیں۔

6- دانتے: یورپ اپنے تاریک دور سے گزر رہا تھا جب چین اپنی تانگ اور سُنگ سلطنتوں کے ساتھ ''بلاشبہ کرۂ ارض کی نہایت روشن خیال اور نہایت ترقی پسند اور بہتر حکومت کی حامل بادشاہت کے طور پر تہذیب کے محاذ پر کھڑا تھا'' (مردوک)۔ یورپ نے رومن انحطاط اور بربری حملے کے طویل ڈراؤنے خواب سے خود کو کتنی سست روی سے بیدار کیا!

لیکن آخر کار شہر پھلے پھولے، نئی دولت اور نئی شاعری کو فروغ ملا؛ فرانس سے لے کر فارس،

اور نژنی نووگورود سے لے کر لسبون تک نو بیدار شدہ تجارت نے ادب اور آرٹ کے نئے گل کھلائے۔ نیشا پور میں عمر خیام نے مایوسی بھری مسرت کی رباعیات گائیں؛ پیرس میں وِلوں نے شعر پہ شعر جوڑے؛ اور فلورنس میں دانتے کی ملاقات بیٹرائس سے ہوگئی اور وہ ہمیشہ کے لیے بدل گیا۔

اسے دیکھیں۔ نو سال کی عمر، ایک ضیافت میں، ہجوم کے درمیان چھپنے کی کوشش کرتا ہوا، اپنے جسم کے ہر عضو اور کمرے میں موجود ہر آنکھ اور ذہن سے باخبر، اِس خیال پر تکلیف زدہ کہ اس قسم کا طاقت ور مرد اور اس قسم کی ایک حسین لڑکی اس پر کیا توجہ دیں گے۔ اچانک بیٹرائس پورٹیناری اس کے سامنے آ گئی — صرف آٹھ سال کی بچی، لیکن فوراً اس پر فریفتہ ہوگئی۔ وہ ابھی اتنا کمسن تھا کہ جسم کے متعلق نہیں سوچ سکتا تھا، مگر اتنا پختہ ذہن کہ دل و جان حوالے کر بیٹھا۔ ''اسی لمحے میں جذبۂ حیات، جو دل کے نہاں خانوں میں رہتا ہے، نے اس قدر شدت سے تحریک پائی کہ رگ رگ میں دہشت پھیل گئی، اور میں لرزتے ہوئے یہ الفاظ بولا: 'دیکھو، مجھ سے زیادہ طاقت ور خدا، جو میرے اوپر حکومت کرے گا۔' '' چنانچہ وہ برسوں بعد لکھتا ہے کہ یادداشت میں کوئی بھی اور چیز پہلی محبت جیسی مٹھاس بھری نہیں ہوتی۔ پھر وہ مزید کہتا ہے:

> میری روح اس نفیس ترین خاتون کی سوچوں سے سرشار تھی؛ میں جلد ہی اس قدر نازک اور نحیف حالت سے دوچار ہو گیا کہ بہت سے دوست مجھے دیکھ کر رنجیدہ ہونے لگے......اور متعدد نے مجھ سے وجہ پوچھنا چاہی جو میں چھپانا چاہتا تھا۔ لیکن ان کے سوالات کو بوجھتے ہوئے میں نے جواب دیا کہ محبت نے میری یہ درگت بنائی تھی۔ میں نے محبت کے متعلق بتایا کیونکہ میرے چہرے پر اتنے زیادہ نشان ہویدا تھے کہ اسے چھپانا ممکن نہیں تھا۔ لیکن جب انہوں نے پوچھا، ''محبت نے تجھے کس کی خاطر تاراج کیا ہے؟'' تو میں نے مسکراتے ہوئے ان کی طرف دیکھا اور کچھ نہ بولا۔

لیکن بیٹرائس نے کسی اور سے شادی کر لی، چوبیس سال کی عمر میں مر گئی، لہٰذا دانتے کے لیے

اسے آخری دم تک چاہنا ممکن تھا۔ اس محبت کی دوہری توثیق کی خاطر اُس نے Gemma dei Donati سے شادی کر لی اور چار بچوں کے علاوہ متعدد لڑائی جھگڑوں کو جنم دیا۔ وہ اُس لڑکی کا چہرہ نہیں بھول سکتا تھا جو وقت کے ہاتھوں اپنا حسن مندمل ہونے سے پہلے ہی مر گئی تھی۔ تشنۂ تکمیل خواہش نے تخیل کی دھار کند نہ ہونے دی۔

وہ سیاست کے میدان میں اترا، شکست کھائی اور جلاوطن ہوا، اور ریاست نے اس کا تمام سامان ضبط کر لیا۔ فلاکت اور سرگردانی کے پندرہ برس بعد اسے پیغام ملا کہ اگر وہ فلورنس کو جرمانہ ادا کر دے اور ایک رہائی یافتہ قیدی کے طور پر الطار کے سامنے ''نذر'' کی تذلیل آمیز تقریب میں آنا قبول کر لے تو شہریت اور جائیداد کے تمام حقوق بحال ہو سکتے تھے۔ اس نے شاعرانہ فخر کے ساتھ پیشکش مسترد کر دی۔ تب شائستہ اہل فلورنس نے — اچھے عیسائی ہونے کے ناتے — فرمان جاری کیا کہ وہ جہاں بھی ملے زندہ آگ میں ڈال دیا جائے۔ وہ پکڑا تو نہ گیا، لیکن روحانی طور پر زندہ جل گیا: وہ بعد ازاں جہنم کی تصویر کشی کے قابل ہوا کیونکہ زمین پر ہی اس کے ہر درجے سے گزرا تھا، اور اگر اس کی پیش کردہ بہشت اتنی واضح نہیں ہے تو اس کی وجہ ذاتی تجربے کا فقدان تھا۔ وہ شہر شہر پھرا، تعاقب زدہ اور بے دوست تھا، اکثر فاقہ کشی کی حد تک پہنچا۔

شاید اس نے اب جو نظم لکھنا شروع کی اسی نے دیوانگی اور خودکشی سے بچا لیا۔ حسن کی تخلیق یا صداقت کی جستجو سے بڑھ کر کوئی بھی چیز انسانی ذہن کی تطہیر نہیں کرتی، اور اگر یہ دونوں انسان میں سما جائیں (جیسا کہ دانتے کے ساتھ ہوا) تو اس کا طاہر بن جانا لازمی ہے۔ یہ سنگ دل دنیا ناقابل سہن تھی ماسوائے (بقول نٹشے) اس نظر کے جس نے اسے ایک ڈرامائی اور جمالیاتی تماشے کے طور پر لیا۔ چنانچہ دانتے نے لکھنے کا عزم کیا: اس نے خوفناک تمثیل میں بتایا کہ کس طرح وہ جہنم میں سے گزرا تھا، کس طرح برزخ میں اپنا تزکیہ کیا، اور کس طرح انجام کار محبت اور دانائی کی راہنمائی میں مسرت کی ایک بہشت پائی تھی۔ چنانچہ پینتالیس برس کی عمر میں اس نے ''دی ڈیوائن کامیڈی'' پر ہاتھ آزمایا — جدید دور کی عظیم ترین نظم۔

وہ ہمیں بتاتا ہے کہ ''اس ہماری زندگی کی بیچ راہ میں'' مَیں گرتا پڑتا ایک تاریک جنگل سے

گزرا اور پھر ورجل کا ہاتھ پکڑ کر چلتے چلتے خود کو جہنم کے دروازے پر پایا۔ وہاں یہ خوفناک عبارت کندہ تھی: ''اے اندر آنے والے، تمام امید ترک کر دے۔'' اطالوی زبان میں ('' Lasciate ogni speranza, voi ch'entratei '') اس کا تاثر ٹانگیں لرزا دینے والا تھا، روح فرسا اور دانت پیستا ہوا۔ وہ بتاتا ہے کہ کس طرح اس نے تمام فلسفیوں کو جہنم میں جمع دیکھا اور فرانچسکا دا ریمینی انہیں پاؤلو کے ساتھ اپنی محبت اور موت کا قصہ سنا رہی تھی؛ اور کس طرح ان اذیت کے مناظر سے گزر کر وہ ورجل کے ہمراہ برزخ میں گیا اور پھر بیٹرائس کی زیر قیادت بہشت میں پہنچا۔ اگر یہ ایک تمثیل نہ ہوتی تو پھر قرون وسطیٰ سے اس کا تعلق بھی نہ ہوتا: شاعر کہتا ہے، ہماری انسانی زندگی ہمیشہ سے جہنم ہے، یہاں تک کہ دانش (ورجل) ہمارے اندر سے تمام بری خواہش نکال دیتی ہے، اور محبت (بیٹرائس) ہمیں مسرت اور شانتی تک سرفراز کرتی ہے۔

خود دانتے کبھی اس قسم کی طمانیت سے ہم کنار نہیں ہوا تھا، بلکہ آخر تک جلاوطن رہا، سکون اور روحانی تسکین سے عاری، جیسا کہ مصور جوتو (Giotto) نے اسے دکھایا۔ لوگوں نے کہا کہ وہ کبھی مسکراتا دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ اس کا ذکر مرعوب انداز میں ایک ایسے شخص کے طور پر کرتے جو جہنم سے ہو کر آیا تھا۔ شکستہ اور نڈھال، قبل از وقت بوڑھا ہو چکا دانتے 1321ء میں بمقام راوینا فوت ہوا تو صرف 56 برس کا تھا۔ 75 برس بعد فلورنس نے اس کی خاک سے معافی مانگی، وہی شخص جو اگر زندہ مل جاتا تو آگ میں پھینکا جاتا۔ لیکن راوینا نے معافی نہ دی۔ اس کا مقبرہ آج بھی اُس نیم بازنطینی شہر کی عظیم یادگاروں میں سے ایک ہے۔ دانتے کے پانچ سو سال بعد وہاں ایک اور جلاوطن — بائرن — گھٹنوں کے بل جھکا اور تفہیم پائی۔

7- ولیم شیکسپیئر: والٹیئر نے کہا، ''دانتے ایک دیوانہ تھا اور اس کی تحریر سراسر کراہت ہے۔ اس کے متعدد مفسرین ہیں، لہٰذا اسے سمجھا نہیں جا سکتا۔ اس کی شہرت میں اضافہ ہوتا رہے گا، کیونکہ کوئی بھی اسے نہیں پڑھتا۔'' اور وہ لکھتا ہے: ''شیکسپیئر، جو لوپے ڈی ویگا کے دور میں گزرا ہے...... ایک بربری ہے'' جس نے ''ٹریجڈیز کہلانے والے مکروہ کھیل تماشے'' لکھے۔

اٹھارہویں صدی کے انگریزوں نے فرانسیسی کے ساتھ اتفاق کیا۔ لارڈ شافٹسبری کہتا ہے، ''شیکسپیئر ایک پھوہڑ اور وحشی ذہن ہے۔'' 1707ء میں ناحوم ٹیٹ نے ایک ڈرامہ ''آتھیلو'' لکھا جس میں کہا گیا کہ اس نے ''بنیادی خیال ایک بے نام مصنف کے ایک کھیل سے لیا تھا۔'' الیگزینڈر پوپ سے پوچھا گیا کہ شیکسپیئر نے اس قسم کے کھیل کیوں لکھے، تو اس نے جواب دیا: ''آپ کو پیٹ بھی تو بھرنا ہوتا ہے۔'' یہ ہے شہرت۔ انسان کو اپنے تبصرہ نگاروں کی تحریریں ہرگز نہیں پڑھنی چاہئیں، اور نہ ہی یہ تجسس کرنا چاہیے کہ آنے والی نسلیں کیا فیصلہ دیتی ہیں۔

ولیم شیکسپیئر کی کہانی ساری دنیا جانتی ہے: اس نے کیسے عجلت میں شادی کی اور کبھی سکون کا سانس نہ لے سکا، کیسے وہ بھاگ کر لندن گیا، اداکار بنا، پرانے ڈراموں کو اپنی روشنی سے دوبارہ زندہ کیا، اور جنگلی مارلو کے ساتھ شہر میں رہا۔ اسے یقین تھا کہ ''تمام چیزوں کا تعاقب ان سے لطف اندوز ہونے کی نسبت زیادہ پرجوش ہوتا ہے''؛ کیسے اس نے چیپ مین اور بین جانسن کے ساتھ جملے بازی کی؛ کیسے ابھرتے ہوئے پیوریطان ازم کے خلاف جنگ کا اعلان کیا، اور خوشی خوشی انہیں دعوت مبارزت دی— ''تم سمجھتے ہو کہ تمہاری پاکبازی کی وجہ سے مزید کوئی روٹی اور شراب نہیں ہو گی؟'' — کیسے اس نے پلوٹارک، فروئیسارٹ اور ہولن شیڈ کو پڑھا، تاریخ سے آگاہی حاصل کی، کیسے مانٹینی کا مطالعہ کیا اور فلسفہ سیکھا؛ کیسے انجام کار سیکھنے، دکھ اور ناکامی کے ذریعے وہ اپنے عہد کے تمام ڈرامہ نگاروں کا ولیم الفاتح بنا، اور تب سے انگلش گو دنیا پر حکمران ہے۔

اس کی بھرپور اور بے لگام توانائی اس کے جینیئس اور نقائص کا ماخذ تھی؛ اِس نے اُسے ڈراموں کی گہرائی اور جوش عطا کیا، اور جڑواں بچوں اور قبل از وقت موت سے ملایا۔ وہ راستے میں کوئی بدمعاشی کیے بغیر سٹریٹفورڈ میں اپنے گھر بھی نہیں جا سکتا تھا؛ کیونکہ وہ ہمیشہ آکسفورڈ میں مسز ڈیویننٹ کی سرائے میں رکتا تھا (سٹریٹ فورڈ اور آکسفورڈ آئرلینڈ جانے کے لیے سٹیج کوچ یعنی بگھی کے راستے پر دو چوک/ ford تھے) اور انجام کار وہاں اپنے پیچھے ایک نوجوان ولیم ڈیویننٹ چھوڑ گیا جو ادنیٰ سا شاعر بنا اور اپنی ولدیت کے متعلق کبھی شکایت نہ کی۔ ایک مرتبہ لڑکا بھاگا بھاگا سرائے کی طرف جا رہا تھا کہ کسی کے سوال نے اس کے قدم روک لیے: ''تم کہاں جا رہے ہو؟''

لڑکے نے جواب دیا، ''اپنے گاڈ فادر ولیم شیکسپیئر سے ملنے۔'' وہ شخص بولا، ''میرے بچے، خدا کا نام بے کار میں مت لو۔''

جب اسے دربار میں کھیل پیش کرنے کی دعوت دی گئی تو وہ حسیناؤں اور شجاع مردوں کی تمازت میں کچھ دیر سستاتا رہا اور میری فِٹن یا کسی اور نام کی کسی اور ''تاریک خاتون'' پر فریفتہ ہو گیا۔ Dame Quickly اور Doll Tearsheet اس کے ڈراموں میں سے غائب ہو گئیں، اور شاہانہ پورٹیا داخل ہوئی۔ اس کی روح رومانس اور کامیڈی سے ابل رہی تھی، اور اس کا جذبہ وائیولا اور روزالنڈ اور ایریئل تخلیق کرنے کے لیے مچل رہا تھا۔ لیکن محبت کبھی قانع نہیں ہوتی؛ اس کے نہاں خانۂ دل میں ایک زہریلی تشویش، بیگانگی اور انحطاط کی ایک پیشگی تنبیہ موجود ہے۔ روزالنڈ کہتی ہے، ''محبت محض دیوانگی ہے، اور میں تمہیں بتاؤں کہ دیوانوں کی طرح یہ بھی ایک تاریک مکان اور چابک کی مستحق ہے۔'' Biron نے کہا، ''آسمان کی قسم، مجھے محبت ہے، اور اس نے مجھے افسردگی سکھائی ہے۔''

یہ شیکسپیئر کی ٹریجڈی کا قلب اور اس کی زندگی کی اوج تھی، کہ اس کا عزیز ترین دوست ڈبلیو ایچ (جسے اس نے اپنے لامحدود محبت کے سانیٹس میں مخاطب کیا) آیا اور اس کے نئے شوق کی ''تاریک خاتون'' چرالی۔ وہ غضب ناک ہوا اور سانیٹس میں دیوانگی اور شک کے گیت اضافہ کیے؛ وہ دکھ اور تکلیف کے ایک جہنم سے دوچار ہوا، دل کو رنج و غم کے تیروں سے چھلنی کیا اور ''ہیملٹ''، ''آتھیلو''، ''میکبتھ''، ''ٹِمون'' اور ''لیئر'' میں سب کے سامنے پیش کیا۔ لیکن اذیت نے اسے عمق عطا کی؛ اب وہ آسان کامیڈیز اور سادہ کردار چھوڑ کر پیچیدہ شخصیات کی طرف آیا جو ژولیدہ المناکیوں سے گزر کر تاریک ناگزیر مقدروں سے دوچار ہوتی تھیں۔ وہ مایوسی کے توسط سے عظیم ترین شاعر بن گیا۔

شیکسپیئر کے کلام کی دیوانگی اور گداز ہمیں سب سے زیادہ پسند ہے۔ اس کا انداز اپنی زندگی کا عکس ہے، توانائی، بے قراری، رنگ اور بے لگامی سے بھرپور؛ ''زیادتی (excess) جیسی کامیابی کسی بھی چیز کو نہیں ملتی۔'' یہ انداز سراسر عجلت اور بے سانس ہے؛ شیکسپیئر نے بہت جلدی میں لکھا،

اور کبھی بھی پچھتانے کی فرصت نہیں ملی۔ اس نے کبھی کوئی لائن نہ مٹائی یا پروف نہ پڑھا؛ اس کے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ کسی روز اس کے کھیل پیش کرنے کے بجائے پڑھے جائیں گے۔ مستقبل سے بے فکر ہو کر اس نے بے لگام شوق کے ساتھ لکھا۔ الفاظ، تمثیلات، جملے اور تصورات کا غیر مختتم اور بوکھلا دینے والا سیلاب بہ نکلا۔ آپ حیران رہ جاتے ہیں کہ وہ کیسے شورش انگیز چشمے پیدا کرتے ہیں۔ ''اس کے دماغ میں جملوں کی ایک ٹکسال لگی ہے'' اور اس کی لطیف دیوانگی سراسر تخیل ہے۔

کبھی کسی شخص کو زبان پر ایسی قدرت حاصل نہیں رہی، یا کبھی کسی نے اِسے اِس قدر شاہانہ انداز میں استعمال نہیں کیا تھا۔ اینگلوسا کسن الفاظ، فرانسیسی الفاظ، لاطینی الفاظ، شراب خانوں کے الفاظ، قرون وسطیٰ کے الفاظ، قانونی الفاظ؛ ہکلاتی ہوئی یک لفظی سطریں اور گونج دار طویل تقریر؛ کافی حد تک خواتین جیسا ادبی انداز اور خام فحش کلمات: ایلزبتھ کے عہد کا کوئی شخص ہی اس قسم کی انگلش لکھنے کی جرات کر سکتا تھا۔ اب ہمارے آداب بہتر اور طاقت کم ہو گئی ہے۔ ہاں، پلاٹس ناممکن ہیں، جیسا کہ ٹالسٹائی نے کہا؛ پھبتیاں بچگانہ ہیں، علمی خطائیں بیکنی عہد والی نہیں، اور فلسفہ پسپائی اور مایوسی والا ہے — اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جس بات سے فرق پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر صفحہ روح کی دیوتا نما توانائی ہے، اور اس بنیاد پر ہم کسی انسان کو کچھ بھی معاف کر دیں گے۔ زندگی تنقید سے ماوراء ہے، اور شیکسپیئر زندگی سے زیادہ جان دار۔

8-جان کیٹس: آیئے ایک لمحے کو رکتے ہیں، اور گنتے ہیں کہ ہم کتنے عظیم آدمیوں کو نظر انداز کر آئے: اول، سافو، ایک لیزبیئن چٹان پہ بیٹھ کر محبت کے غنایئے پھینکتی ہوئی؛ پھر ایسکائی لس اور سوفوکلیز، جنھوں نے ڈایونیشیائی انعام یوری پیڈیز سے کہیں زیادہ مرتبہ جیتا؛ لطیف کیٹولس، شاہانہ ہوریس، زندگی سے بھرپور اووِڈ اور خوش گوار ورجل؛ پیٹرارک اور تاسو، عمر-فٹز جیرالڈ، چوسر اور ولوں۔ لیکن یہ خطا اُن گناہوں سے بہت چھوٹی ہے جو ابھی ہم کرنے والے ہیں؛ حتیٰ کہ ملٹن اور گوئٹھے کو بھی نہیں چنا گیا؛ حتیٰ کہ بلیک اور برنز، بائرن اور ٹینی سن، ہیوگو

اور پال ورلین، ہائنے اور پوپ کو چھوڑ دیا گیا۔ نظم کا ذہن ہائنے، اور شاعری کا نصف بہتر پو؛ ان سے دامن بچانا ناقابل معافی معلوم ہوتا ہے۔ ٹینی سن، جس کا ہر گیت خوب صورت تھا، اور برائن، جس کی زندگی ایک غنائی ٹریجڈی تھی؛ آخر وہ عظیم تر کون ہیں جن کی خاطر انہیں چھوڑ دیا گیا؟ بدترین بات یہ کہ ملٹن کو بھی منتخب نہ کیا گیا جس نے بادشاہوں اور حاکموں کی طرح لکھا اور انگلش کو یسعیاہ کی عبرانی جیسا گرج دار اور گونج دار بنا دیا۔ گوئٹے کو چھوڑ دینا اور بھی بری بات ہے، جرمنی کی روح جس نے اپنی جوانی میں ہائنے کی طرح لکھا، پختہ عمر میں یورپی پیڈیز والا انداز اختیار کیا، اور بڑھاپے میں گوتھک گرجا گھر جیسا بن گیا— ژولیدہ خیال اور غیر مختتم طور پر حیرت انگیز؛ کونسا اچھا جرمن یا اچھا یورپی اس چیز کو معاف کرے گا؟ چلیں کوئی بات نہیں؛ آیئے یہ گناہ جراتمندی سے کرتے اور فلسفی گوئٹے کے بجائے شاعر جان کیٹس کا نام لیتے ہیں۔

1819ء میں دق زدہ کیٹس نے ہفتوں بستر سے لگے رہنے کے بعد صحت مند ہونے پر فینی بران کے نام لکھا: ''اب مجھے بے قرار اور بیدار راتیں گزارنے کے مواقع ملے تو ان سوچوں کو جانا جو میرے سر پہ منڈلاتی رہتی ہیں۔ میں خود سے کہتا ہوں، 'اگر میں مر گیا تو میرا کوئی لافانی کام پیچھے نہیں ہوگا— کوئی بھی ایسی چیز نہیں جس پر میرے دوست فخر کر سکیں— لیکن میں نے تمام چیزوں میں اصولِ حسن سے محبت کی ہے، اور اگر مجھے وقت ملتا تو خود کو یادگار بنا دیتا۔' '''اگر مجھے وقت ملتا''— یہ تمام عظیم لوگوں کا المیہ ہے۔ کیٹس نے اس کے بعد کبھی کوئی قابل ذکر شاعری نہ لکھی؛ بایں ہمہ، اس کے دوستوں نے اُسے اُس کی وجہ سے یاد رکھا، اور وہ اپنے پیچھے انگلش زبان جیسی ہی لافانی نظمیں چھوڑ گیا جو شیکسپیئر سے بھی زیادہ کامل ہیں۔ ہم اس کے متعلق مزید کچھ نہیں کہیں گے، لیکن اس کی یاد تازہ کرتے چلیں۔ وہ عندلیب کے لیے نغمہ خواں ہے:

Darkling I listen; and for many a time
I have been half in love with easeful Death,
Called him soft names in many a mused ryhme,
To take into the air my quiet breath;
Now more than ever seems it rich to die,
To ease upon the midnight with no pain,

While thou art pouring forth thy soul abroad
In such an ecstasy!
Still wouldst thou sing, and I have ears in vain
To thy high requiem become a sod.

اور یہ چند سطریں بنام دیوانگی:

She dwells with Beauty, Beauty that must die;
And Joy, whose hand is ever at his lips
Bidding adieu; and aching pleasure nigh,
Turning to poison while the bee-mouth sips;
ay, in the very temple of Delight,
Veil'd Melancholy was her sovron shrine;
Though seen of none save him whose strenuous
tongue
Can burst Joy's grape against his palate fine;
His soul shall taste the sadness of her might,
And be among her cloudy trophies hung.

وہ سورج کی تلاش میں انگلینڈ سے اٹلی گیا، لیکن سمندر کے طوفانوں نے اس کا جسم چیر پھاڑ ڈالا، اور جنوب کی خاک نے اس سے اچھا سلوک نہ کیا۔ وہ وقتاً فوقتاً خون کی قے کرتا۔ اس نے کہا کہ فینی بران کے خطوط اس سے لے لیے جائیں؛ وہ انہیں پڑھنا سہہ نہیں سکتا تھا۔ اس نے اپنے دوستوں کو خطوط لکھنا بند کر دیے۔ اس نے زہر کھانا چاہا، لیکن Severn نے کامیاب نہ ہونے دیا۔ Severn نے کہا، ''موت کا تصور اس کے لیے واحد راحت لگتا ہے۔ وہ بہت خوشی سے اس کی بات کرتا ہے۔ بحالیٔ صحت کی بات اسے کسی بھی چیز سے زیادہ دہشت ناک لگتی ہے۔'' آخری دنوں میں ''اس کا ذہن بالکل شانت اور پرسکون ہو گیا تھا۔'' اس نے اپنا تعویذ قبر لکھوایا: ''یہاں ایک شخص محوِ آرام ہے جس کا نام پانی پر تحریر ہے۔'' اس نے بار بار ڈاکٹر سے کہا: ''میری یہ بعد از موت زندگی کب اختتام پذیر ہوگی؟'' آخری کشمکش میں اس نے کہا: ''Severn — مجھے اوپر اٹھاؤ، کیونکہ میں مر رہا ہوں۔ میں آسانی سے مروں گا۔ خوف مت کھاؤ۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ لمحہ آ گیا۔'' یہ 23 فروری، 1821ء کا دن تھا، اور اس کی عمر پچیس برس تھی۔ ''اگر مجھے وقت ملتا''!

9- پرسی بائشی شیلی: جب شیلی نے ''Quarterly Review'' کے توسط سے کیٹس

کی موت کی خبر سنی تو عزلت نشین ہو گیا اور اپنا غم وغصہ انگلش زبان کے عظیم ترین مرثیوں ''Adonais'' میں انڈھیل دیا۔ اس نے ہوائے تقدیر کے لیے اپنی نسوانی حساسیت کے ساتھ لازماً محسوس کیا ہوگا کہ اس کا اپنا مقدر کیٹس کے مقدر کے ساتھ کس قدر قریبی طور پر بندھا ہوا تھا۔۔ کتنی جلدی وہ بھی شاعری اور حقیقت کی ابدی جنگ میں شکست کھا گیا۔

شیلی نے (جیسا کہ سر ہنری مین نے کہا) اپنی زندگی اور فکر کی بنیاد ''فطرت کی حالت'' پر رکھی تھی، عہد زریں کے بارے میں روسو کے خواب پر جس میں تمام انسان مساوی ہوا کرتے تھے یا ہوں گے، اور وہ ''تاریخی طریقۂ کار'' کا شدید مخالف تھا جو آئیڈیلز کو حقیقتوں اور امنگوں کو تاریخ کے ساتھ متوازن کرتا ہے۔ وہ تاریخ نہیں پڑھ سکا تھا؛ یہ اسے صعوبتوں اور جرائم کا ایک مکروہ ریکارڈ معلوم ہوتی تھی؛ اپنے مطالعہ کردہ ہر عہد میں اس نے انسانوں کے اصل طرز عمل اور مدوجذر کو نہ تلاشا، بلکہ ان کی شاعری اور مذہب، ان کے آئیڈیل احساسات اور خواہشات پر توجہ مرکوز کی؛ وہ تھیوسی ڈائیڈز کی نسبت ایسکائی لس کو زیادہ بہتر طور پر جانتا تھا؛ اور وہ بھول گیا کہ ایسکائی لس کا پرومیتھیئس بندھا ہوا تھا۔ اس کی صعوبت سے بڑھ کر کونسی چیز یقینی ہو سکتی تھی؟

وہ اپنے ''حساس پودے'' جیسا حساس تھا، جو اسی کی طرح فوری انحطاط پذیر تھا جبکہ زیادہ کرخت ریشے پھلتے پھولتے اور باقی رہتے تھے۔ اس نے خود کو جولیان کے توسط سے یوں بیان کیا، ''میں وہ عصب ہوں جس پر اِس کرۂ ارض کے مظالم رینگتے ہیں جو بصورت دیگر نامحسوس ہیں۔'' اس نفیس و نازک لڑکے کو دیکھ کر کسی نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ اس نے سارے انگلینڈ کو اپنی کافرانہ باتوں سے سیخ پا کر دیا تھا۔ Trelawney نے اس سے پہلی مرتبہ ملنے کے بعد لکھا: ''کیا ایسا ممکن تھا کہ بظاہر دھیمے مزاج کا بے ریش لڑکا دنیا کے ساتھ برسر جنگ مطلق عفریت ہو؟'' مصور McCready نے کہا کہ وہ شیلی کا چہرہ نہیں بنا سکتا تھا، کیونکہ وہ ''حد سے زیادہ خوب صورت'' اور جُل دے جانے والا تھا؛ اس آدمی کی روح کہیں اور تھی۔

کبھی کوئی شخص اس قدر مکمل یا خصوصی طور پر شاعر نہیں رہا تھا۔ وہ شاعروں میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو اس سے پہلے سپنسر نے پائی۔۔ شاعری سے جو کچھ بھی مراد ہے اس کی تجسیم نہایت۔ اس

نے اپنے مشہور ''Defense'' میں لکھا کہ شاعری اور ذات، جس کی مرئی تجسیم دولت ہے، کا اصول دنیا کا خدا اور مامونہ (Mammon) ہیں......لیکن یہ بات تصور سے بالاتر ہے کہ اس صورت میں دنیا کی اخلاقی حالت کیا ہوتی اگر دانتے، پیٹرارک، بوکاشیو، چوسر، شیکسپیئر، کالدریاں، لارڈ بائرن یا ملٹن پیدا نہ ہوئے ہوتے؛ اگر رافیل اور مائیکل اینجلو کبھی پیدا نہ ہوئے ہوتے، اگر عبرانی شاعری کبھی ترجمہ نہ ہوئی ہوتی؛ اگر مطالعۂ یونانی ادب کی بحالی کبھی واقع نہ ہوئی ہوتی؛ اگر قدیم مجسموں کی کوئی یادگاریں ہم تک نہ پہنچی ہوتیں؛ اگر قدیم دنیا کے مذہب کی شاعری بھی اس کے عقائد کے سنگ جل بجھی ہوتی۔''

8 جولائی 1822ء کو شیلی اور اس کا دوست ولیمز Casa Magni سے روانہ ہوئے جہاں وہ Lerici جزیرے پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ شیلی کی کشتی ''Ariel'' پر سوار ہوئے اور Spezzia کھاڑی سے Leghorn کی راہ لی تاکہ فلاکت زدہ Leigh Hunt اور اس کے وسیع کنبے سے ملاقات کر سکیں۔ شیلی نے نہایت لاپروائی سے انہیں اٹلی آنے کی دعوت دی تھی۔ چھوٹی سی کشتی بحفاظت منزل پر پہنچی لیکن واپسی پر سب کو لے کر آ رہی تھی کہ آسمان نے طوفان کا اعلان کر دیا۔ ہنٹ نے کہا کہ وہ وہیں رکتا ہے اور اپنے کنبے کو لے کر اگلے دن آ جائے گا، لیکن شیلی نے Lerici واپس پہنچنے پر اصرار کیا؛ میری شیلی اور اور مسز ولیم اکیلی رہ گئی تھیں، اور اگر مرد وقت پر نہ آتے تو انہیں پریشانی ہوتی۔ جب دونوں نوجوان گودی سے روانہ ہوئے تو قریب سے گزرنے والے بحری جہازوں پر سوار ملاحوں نے انہیں تنبیہ کی کہ واپس پلٹ جائیں۔ لیکن وہ آگے بڑھتے گئے۔

اُس رات جب وہ Casa Magni نہ پہنچ سکے تو میری شیلی کو پتا چل گیا کہ قسمت نے اس کا شاعر چھین لیا ہے۔ وہ شدید پریشان ہوئی اور اگلے روز صبح سویرے کشتی کرائے پہ لے کر Leghorn کی طرف روانہ ہوئی۔ وہاں اُسے ہنٹ اور بائرن ملے، لیکن ولیمز یا شیلی نہیں۔ بائرن جوش و خروش سے کام میں لگ گیا اور ساحل کا چپہ چپہ چھان مارا۔ کہیں آٹھ روز بعد جا کر ہی انہیں ریت پر ولیمز کی لاش پڑی ملی، پھولی ہوئی اور تقریباً ناقابلِ شناخت؛ جبکہ شیلی کی لاش ملنے میں مزید دو دن لگ گئے ــــ اس کی باقیات میں صرف ہڈیاں اور کچھ گوشت تھا جو گدھ نوچ نہ پائے

تھے؛ چہرہ نا قابل شناخت ہو گیا تھا؛ ایک جیب میں سے سوفو کلیز اور دوسری میں سے کیٹس نکلنے پر ہی اس کی شناخت ہو سکی۔

ٹسکنی کا قانون تھا کہ سمندر کی اگلی ہوئی لاشوں کو جلا ڈالا جائے تا کہ وبا سے بچا جا سکے۔ چنانچہ بائرن اور ہنٹ اور Trelawney نے چتا تیار کی اور جب لاش آدھی جل چکی تھی تو Trelawney نے شعلوں میں سے دل نوچ کر باہر نکال لیا۔ بیوہ نے اس کا نیم سوختہ دل روم کے پروٹسٹنٹ قبرستان میں کیٹس کے قریب دفن کیا اور کتبے پر سادہ سے الفاظ لکھے Cor cordium — ''قلب القلوب۔'' 29 سال بعد جب وہ مری تو پتا چلا کہ اس کے پاس موجود ''Adonais'' کی کاپی میں (نقرئی کاغذ میں لپٹی ہوئی) عاشق کی راکھ بھی تھی، اس صفحے میں رکھی ہوئی جہاں لافانیت اور شکست خوردہ انسانیت میں سے ہمیشہ پھوٹتی رہنے والی امید کا ذکر ہے۔

10-والٹ وِٹمین:

Come, Muse, migrate from Greece and Ionia;
Cross out, please, those immensely overpaid
accounts,
That matter of Troy, and Achilles' wrath, and
Aeneas', Odysseus' wanderings;
Placard "Removed" and "To Let" on the rocks of your
snowy Parnassus;
Repeat at Jerusalem—place the notice high on
Jaffa's gate, and on Mount Moriah;
The same on the walls of your Gothic European
Cathedrals, and German, French and Spanish
Castles;
For know a better, fresher, busier sphere—a wide,
untried domain awaits, demands you.
I heard that you asked for something to prove this
puzzle, the New World,
And to define America, her athletic Democracy;
Therefore I send you my poems, that you behold in
them what you wanted.

یہ تاریخِ ادب میں ایک عظیم انقلاب تھا جب ایک ایسا انسان نمودار ہوا جس نے شاعری کے عناصر کو، انسانی ڈرامہ کے مناظر کو عین اپنے آس پاس کی زندگی میں دیکھا؛ جس نے پہل کار کے جذبے کو گیت میں سمونے کا طریقہ ڈھونڈا، اور جس نے دیکھا کہ غیر فطری زندگی کے تمام دیوان خانوں کی نسبت ستاروں تلے کہیں زیادہ شاعری موجود تھی۔ تقریباً پہلی مرتبہ کسی شاعر نے عام انسانوں کی زندگی میں ایسے موضوعات دیکھے جو بلند پایہ نظم کے لائق تھے؛ اس نے لوگوں کو ادب میں رفعت دی اور شاعری میں ''آزادی اور حقوق انسانی کا اعلامیہ'' بنا۔ اس نے آرتھر یا فراموش ہو چکے دیوتاؤں کی کسی اور بھلائی جا چکی اسطورہ کا مردہ آئیڈیل مجسم نہ کیا، بلکہ اپنے ملک، اپنی مبہم جمہوریت، اپنے تلاطم خیز اور نشوونما پاتے ہوئے وقت کو لیا۔ جو کچھ یونان کے لیے ہومر، روم کے لیے ورجل، اٹلی کے لیے دانتے، انگلینڈ کے لیے شیکسپیئر تھا، وہی کچھ وہ امریکہ کے لیے تھا، کیونکہ اس نے امریکہ کے اندر جھانکنے کی جرات کی، اس کی تمام خامیوں اور نقائص، اس کے مضامین گیت سمت۔ اس نے امریکہ کو نظم کی صورت میں ایک نئی زندگی دی، خود اپنے جیسی ہی ڈھیلی ڈھالی اور غیر منضبط، رواں اور زور دار۔ اور اس نے اِس قدر صداقت کے ساتھ مشاہدہ کیا اور گایا کہ آخرکار نہ صرف جمہوریت اور امریکہ بلکہ، اپنی روح کی عظمت اور اپنی بصیرت کی ہمہ گیریت کی بدولت، جدید دنیا کا شاعر بن گیا۔

ایک فرانسیسی نقاد کے بقول، ''Leaves of Grass'' کا اچھوتا پن شاید آج تک کے ادب میں آشکار ہونے والے اچھوتے پن میں سے مطلق ترین ہے۔'' اچھوتا پن سب سے پہلے الفاظ میں: یہاں زبان کی باریکیاں موجود ہیں اور نہ ہی شیلی جیسا مابعدالطبیعاتی غبار بلکہ مردانہ اسم صفت اور اسم، سادہ بے لاگ الفاظ ملتے ہیں جنہیں جراتمندی کے ساتھ گلیوں بازاروں اور کھیتوں کھلیانوں سے اٹھا کر شاعری کے رتبے پر سرفراز کیا گیا۔ اس کے بعد ہیئت کا اچھوتا پن آتا ہے: کوئی قافیہ نہیں، ماسوائے کہیں کہیں پیش آنے والی کوتاہیوں کے، جیسے ''Captain, My Captain''؛ اور کوئی باقاعدہ ردیف یا ترنم نہیں، لیکن صرف ایسے آزادانہ اور متنوع سُر جو سانسوں، یا ہوا، یا سمندر سے عیاں ہوسکیں۔ سب سے بڑھ کر مواد کا اچھوتا پن: فطرت کی انجانی

اور قدیم حیرتوں کو سراہنے کے لیے بچے جیسا سادہ انداز (''طلوع آفتاب کا بے شور چھپاکا،'' ''زمین پر لہروں کے دیوانہ وار تھپیڑے'')؛ خود کو بین طور پر اپنے تجربے میں آنے والے ہر نفس کے ساتھ شناخت کرنا (''میری آواز بیوی کی آواز ہے، سیڑھیوں کی ریل کی چنگھاڑ؛ وہ میرے آدمی کا جسم اوپر لاتے ہیں، نچڑتا اور ڈوبا ہوا'')؛ ایک کشادہ ذہن کا شجاعت مندانہ خلوص، تمام مسالک کو مسترد اور پسند کرتا ہوا؛ بدن کا واشگاف اور شہوت خیز احساس، کشادہ راہ گزر کی تیکھی مہک؛ عورت کی مدافعت اور تفہیم:

The old face of the mother of many children!
Whist! I am fully content..
Behold a woman!
She looks out from her quaker cap—her face
is clearer and more beautiful than the sky.
She sits in an arm-chair, under the shaded porch
of the farmhouse,
The sun just shines on her old white head.
Her ample gown is of cream-hued linen
Her grandsons raised the flax, and her grand
daughters spun it with the distaff and the
wheel.
The melodious character of the earth,
The finish beyond which philosophy cannot go, and
does not wish to go,
The justified mother of men—

انفرادیت پسندی اور جمہوریت کی عمیق تالیف؛ اس کے تخیل اور جذبۂ ہمدردی کی کائناتی لہر، سب لوگوں کو قبول کرتی اور دنیا کو سلام کرتی ہوئی: یہ قدیم جھریوں اور سانچوں میں پھنسی ہوئی تمام روایات، تمام تعصبات، تمام جذبات کے لیے ایک زوردار دھچکا تھا؛ اور اس کے نتیجے میں ہونے والے احتجاجات نے ہی ان کی طاقت اور لازمی حیثیت کو ثابت کیا۔ ماسوائے ایک آدمی کے سارے امریکہ نے اسے مسترد کر دیا۔ ایمرسن نے 21 جولائی 1855ء کو وٹمین کے نام خط میں لکھا:

جناب عالی:

میں " Leaves of Grass " کی شان دار تحفے کی قدرو قیمت سے نابلد نہیں۔ مَیں اسے زیرکی اور دانش کا ایسا غیر معمولی نمونہ سمجھتا ہوں جو آج سے پہلے امریکہ کو نصیب نہیں ہوا۔ میں اسے پڑھ کر بہت خوش ہوا، کیونکہ زبردست طاقت ہمیں مسرور کرتی ہے.... میں آپ کو آپ کی آزاد اور بہادرانہ فکر کی مسرت دیتا ہوں... ایک عظیم کیریئر کی ابتدا کرنے پر میری طرف سے مبارک باد۔ یہ ابتدا بتاتی ہے کہ آپ کو ابھی بہت دور تک جانا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں کو تھوڑا سا ملا تاکہ دھوپ کی اس کٹار کے ایک سراب نہ ہونے کا یقین کر سکوں؛ کیونکہ کتاب کا ٹھوس مفہوم ایک متین قطعیت ہے.... میں اپنے عزیز سے ملنا چاھتا ہوں، اور امید ہے کہ نیویارک آنے پر آپ کو سلام کرنے حاضر ہوں گا۔

...... رالف والڈو ایمرسن

وِٹمین چلا گیا— لیکن یہ کل کی بات لگتی ہے! اس کے دور میں ہم ہنوز بچے تھے؛ حتیٰ کہ اُس وقت ہمارے عہد میں دیوقامت شخصیات موجود ہو سکتی ہیں، اور حتیٰ کہ بیہودہ اور نوخیز امریکہ بھی ایک بے مثال اور بہترین شاعر پیدا کرسکا۔ کچھ ماہ قبل میں اس کے کیمڈن والے گھر میں کھڑا تھا، جہاں وہ کئی برس تک فالج کے ہاتھوں لاچار پڑا رہا؛ اور مجھے وہ سب نشانیاں دیکھ کر بہت دکھ ہوا جو بتاتی ہیں کہ جینیئس لوگوں کو بھی مرنا ہوتا ہے۔ لیکن تب میں نے اس کی ایک کتاب اٹھائی اور ایک

مرتبہ پھر وہ سطریں پڑھیں جو ہمیشہ میرے سر پر منڈلاتی رہی تھیں۔ میں ان سطروں کو یہاں الوداعی الفاظ کے طور پر پیش کر رہا ہوں تا کہ یہ ہمیشہ حافظوں میں موجود رہیں:

I depart as air— I shake my white locks at the
    runaway sun
I effuse my flesh in eddies, and drift it in lacy jags.
I bequeath myself to the dirt to grow from the grass
    I love.
If you want me again look for me under your
    boot-soles.
You will hardly know who I am or what I mean
But I shall be good health to you nevertheless,
And filter and fibre your blood.

Failing to fetch me at first keep encouraged
Missing me one place, search another
I stop somewhere waiting for you.

باب 4

تعلیم کے لیے ایک سو بہترین کتب

اگر میں بہت امیر ہوتا تو کہتا کہ میرے پاس بہت سی کتابیں ہیں، اور میں ان کی چمک دار جلد، کاغذ کے نرم لمس اور فیاض شفافیت، اور پرنٹنگ کے بہت ابتدائی دور میں ڈیزائن کیے ہوئے ٹائپ کو دیکھ کر خوش ہوتا۔

میں اپنے دیوتاؤں کو چمڑے اور سونے کے لبادے پہناتا اور رات کے وقت ان کے حضور عقیدت کی شمعیں روشن کرتا، اور ان کے نام تسبیح کے دانوں کی طرح پروتا۔ میری اپنی کشادہ اور تاریک اور ٹھنڈی لائبریری ہوتی، جہاں بیرونی نظروں اور آوازوں کا گزر نہ ہوتا، جس کے کم چوڑے دریچے خاموش کھیتوں میں کھلتے، آرام دہ کرسیاں سنگت اور خیال آرائیوں پر مدعو کرتیں، اِدھر اُدھر معبدوں پر شیڈز والے لیمپ روشن ہوتے، اور دیواروں کے چپے چپے پر ہماری نسل کی ذہنی میراث مضمر ہوتی۔ اور وہاں کسی بھی وقت میرا ہاتھ یا روح میرے دوستوں کا استقبال کرتے۔

میں اپنی کتابوں کے عبادت خانے کے مرکز میں دنیا بھر کے علم انگیز ادب کی ایک سو بہترین کتب جمع کرتا۔

میں اپنے تصور میں ایک بہت بڑی میز دیکھتا ہوں؛ ویسٹ منسٹرا ایبی کے مقام پر بادشاہ ہنری کے عبادت خانے کے لیے کندہ کاری کرنے والے آرٹسٹوں نے اس میز پر کام کیا ہے (میں ضرور کوئی بوڑھاری ایکشنری ہوں، کیونکہ مجھے آج کل کے کنکریٹ سے بنے ہوئے گھروں اور لوہے کے بیڈز اور میزوں سے نفرت ہے، اور لکڑی سے بنی ہوئی کسی بھی چیز کے لیے میرے اندر فطری رغبت موجود ہے)۔ میز کے وسط میں شیشے کا ایک ڈبہ رکھا ہے جس کے اندر میری ''ایک سو بہترین'' کتب موجود ہیں۔ میں تصور کرتا ہوں کہ ہر ہفتے کئی گھنٹوں تک وہاں میرے دوستوں کے ساتھ بہت مہربان سلوک کیا جاتا ہے۔ وہ پر محبت توجہ کے ساتھ ایک ایک جلد اٹھا کر دیکھتے ہیں۔

کیا آپ سب حضرات تشریف رکھیں گے؟ شاید آپ کالج گریجوایٹ ہیں اور اب اپنی تعلیم 'شروع' کرنے کو تیار ہیں۔ شاید آپ کو کبھی کالج جانے کا موقعہ ہی نہیں ملا اور آپ نے کبھی غور نہیں کیا کہ ہمارے بچوں کو تازہ ترین اخلاقی اصولوں کے سوا اور کیا سیکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر وہ کافی عمر گزرنے کے بعد آئے ہیں تو شاید بہت سی اعلیٰ باتیں سیکھ سکیں، لیکن آج کل کے پیچیدہ دور میں بڑا ہونے میں اتنا وقت لگتا ہے کہ کالج میں داخلہ لینے پر ہمارے نوجوان اس قدر ناپختہ ہوتے ہیں کہ اپنے سامنے پیش کیے گئے خزانوں کو جذب کرنے یا سمجھنے کے قابل نہیں ہو پاتے۔ اگر آپ نے کورسز کے بجائے زندگی کے ساتھ رہ کر مطالعہ کیا ہے تو تب بھی یہی صورت حال ہوگی؛ حقیقت کی خام اتالیقی نے عظیم لوگوں کو جاننے کے لیے آپ میں کچھ آمادگی پیدا کر دی ہے۔ یہاں اس کشادہ میز پر آپ ''ذہن کی بین الاقوامیت'' کی رکنیت حاصل کرنے کے لیے خود کو تیار کریں گے؛ آپ افلاطون اور لیونارڈو، بیکن اور مانتینی کے دوست بنیں گے؛ اور اس زبردست صحبت کا مرحلہ گزر جانے پر اپنے عہد اور مقام کے بہترین راہنماؤں کی ہمراہی کے لیے موزوں ہوں گے۔

کیا آپ اپنے دن کا ایک گھنٹہ نکال سکتے ہیں؟ یا اگر کچھ دن زندگی سے اس قدر پرہجوم ہیں اور ذمہ داریوں کی وجہ سے ان لطیف باتوں کے لیے فرصت نکالنا ممکن نہیں تو کیا آپ کتاب سے

عاری شاموں کی تلافی اتوار کی صبحوں کو ایک دو فالتو گھنٹوں سے کر سکتے ہیں جب بے شمار اخبارات آپ کو متواتر سرگرداں رکھتے ہیں؟ مجھے ہفتے میں سات گھنٹے دیں، اور میں آپ میں سے ایک دانشور اور ایک فلسفی نکال لوں گا؛ چار سال میں آپ ملک کے نوخیز ڈاکٹر آف فلاسفی جتنے بہتر تعلیم یافتہ ہوں گے۔

لیکن آیئے ایک دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں: آپ کو عظیم لوگوں کے ساتھ اس قربت سے کسی مادی فائدے کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ شاید اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی پختگی اور پس منظر کی وجہ سے آنے والے برسوں میں اتفاقاً کچھ دولت بھی مل جائے، لیکن انشورنس کمپنی کے منافعوں کی طرح یہ رقوم بھی ضمانت یافتہ نہیں۔ دراصل، آپ اپنے پیشے یا کاروبار میں سے ''کچھ وقت'' کھو رہے ہوں گے؛ اگر آپ لاکھوں کمانے کی دوڑ میں ہیں تو بہتر ہے کہ شہر خدا کا نقشہ ایک طرف رکھ دیں اور اپنی ناک زمین پر گھسیٹیں۔ اور اس لکیر پر کچھ رکاوٹیں آئیں گی: گاہے بگاہے آپ کا سامنا کسی مبہم یا ضخیم کتاب سے ہوگا، آگے بڑھنے کے لیے اپنی تمام قوت بروئے کار لانا ہوگی۔ یاد رکھیں کہ ہم قطعی طور پر بہترین ایک سو کتب کی فہرست نہیں بنا رہے؛ یہ شاہکار ادب پاروں کی فہرست بھی نہیں؛ ہم ایسی کتب چن رہے ہیں جو کسی انسان کو تعلیم یافتہ بنانے میں بہترین کردار ادا کریں گی۔

چونکہ ہم مربوط اذہان چاہتے ہیں اور بے ترتیب مطالعہ کی گڑبڑ سے بچنے کے لیے ہم آغاز سے ابتدا کرنا چاہیں گے — حتیٰ کہ بعید ترین ستاروں اور نہایت قدیم زمین کے ساتھ، اور یہ ابتدائیں ہماری راہ کی بدترین رکاوٹیں ہوں گی۔ اہل روم کہتے تھے: ''Initium dimidium facti'' یعنی کام کی ابتدا نصف تکمیل ہے۔ آیئے ان ابتدائی چوٹیوں کو سر کرنے کے لیے کمر باندھیں اور ہمت مجتمع کریں؛ ہر سنگ میل پر علم اور دانش کی مدد سے راہ ہموار ہوتی جائے گی اور ہر طرف خوب صورتی کی خوشگوار جلوہ گری ہوگی۔ ہم یہاں صرف تفریح ہی نہیں بلکہ تعلیم بھی چاہتے ہیں، اور اس انداز میں کہ ہمیں ملنے والا علم ہمارے حافظوں کی منطقی ترتیب کے مطابق بھی ہو، اور ہمیں کم از کم وہ بھرپور تناظر عطا کرے جو تفہیم کا سرچشمہ اور اوج ہے۔

چنانچہ ہماری فہرست میں اولین کتب — بقیہ کا دیباچہ — سب سے زیادہ دہشت ناک ہیں۔ ''The Outline of Science'' کو شروع میں رکھا گیا تو ہزاروں سنگ ہائے دشنام پڑیں گے: افسوس! کیا ہمیں پہلے سے ہضم شدہ کھانا کھانا پڑے گا جو ایک امریکی ناشتے کی طرح تیار کیا گیا ہے؟ مزید بری بات یہ کہ تمام موزوں مورخین کا مستقل مسئلہ ''The Outline of History'' ہماری فہرست میں پانچویں نمبر پر ہے — یہ تو قابل معافی نہیں۔ نقاد کو تھوڑا قابو میں رہنے دیں؛ وہ جلد ہی دیکھے گا کہ یہ کتابیں کتنا زیادہ بطور متبادل اور کتنا زیادہ بہترین کی تیاری کے لیے استعمال ہوئی ہیں۔ تھوڑی سی ناخوشگواری کے عوض ہمیں اپنی اردگرد کی دنیا کے موجودہ سائنسی بیان سے واقفیت پیدا کرنی چاہیے: ہمارے پاس ایک چھوٹا سا فلکیاتی حیاتیاتی پس منظر ہونا چاہیے تاکہ انسانی نسل کے بارے میں اپنے تصور کو کچھ معتدل بنا سکیں؛ ہمیں الیکٹرانز اور کروموسومز کے متعلق کچھ تازہ ترین گپ شپ سے آگاہ ہونا ہوگا، اور طبیعات و کیمیا کے ذریعے دنیا کی تقلیب ہوتے دیکھنا پڑے گا۔

اور بدستور بطور تمہید ہم اپنے آپ تک آتے ہیں۔ صحت کے آرٹ کا کچھ علم بے فائدہ نہیں؛ اگر ہم چار سال بعد عالم فاضل اور چڑ چڑے، تخیل کے فلسفی تو بن گئے مگر ہمارا جسم تباہ حال ہوا تو کیا ہوگا؟ زندگی گزارنے کے متعلق دو عظیم طبیعات دانوں کی مقابل تھیوریز پر غور کرتے چلیں: ڈاکٹر کلینڈننگ (سائنس دان کے لیے باعث بدنامی انداز میں) ہمیں بتائے گا کہ جو چیزیں ہم کھاتے، پیتے، دھوئیں میں اڑاتے یا کرتے ہیں وہ اچھی اور بہتر ہیں، جبکہ ڈاکٹر Kellogg (صرف اپنے ستر سالہ تجربے اور خراب صحت کی بنیاد پر) ہمیں بتائے گا کہ یہ تمام قدیم طور طریقے غلط ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر کیلوگ اکثر جگہوں پر درست کہتا ہے؛ لیکن اکثر جگہوں پر دونوں کا ہی غلط ہونا قابل تصور ہے۔

ہم جسموں کے ساتھ ساتھ ذہن بھی رکھتے ہیں۔ اور شاید ہمیں نوع انسانی کی تاریخ پر غور و فکر کرنے سے قبل خود کو کچھ حد تک جاننے کی کوشش کر لینی چاہیے۔ تو ولیم جیمز کی طرف چلتے ہیں؛ مانا کہ اس نے کوئی ایک پشت قبل لکھا، لیکن اس کی ''Principles of Psychology'' آج بھی

اپنے میدان میں شاہکار ہے۔ ایک جلد میں طبع شدہ مختصر ایڈیشن سے گریز کریں؛ طویل شکل پڑھنے میں زیادہ آسان ہے۔ جب تک آپ جیمز کے گرد جمع ہیں تب تک تحلیلی نفسیات اور کرداریت جیسے عارضی نفسیاتی رواجوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں، اور جیمز کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد آپ ان وباؤں کی زد میں نہیں آئیں گے۔ مجہول کے بجائے مستعد انداز میں مطالعہ کریں: ہر قدم پر غور کریں کہ جو کچھ آپ نے پڑھا ہے وہ اپنے تجربے سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں، اور اپنی زندگی کی راہنمائی کرنے میں اسے کس حد تک لاگو کیا جا سکتا ہے۔ لیکن آپ مصنف کی رائے سے متفق نہ ہوں یا اس کی گستاخیوں پر دم بخود رہ جائیں تو پھر بھی پڑھنا جاری رکھیں۔ اختلافات کو برداشت کرنا نفیس آدمی کے اوصاف میں سے ایک ہے۔ ایسے تمام اقتباسات کے نوٹس بنالیں جو اپنے کردار (کسی اور کے نہیں) کی تعمیر نو یا اپنے اہداف کے حصول کے حوالے سے مددگار رہیں، اور ان نوٹس کو اس طریقے سے زمرہ بند کریں کہ کسی بھی وقت یا کسی بھی مقصد کے تحت آسانی سے قابل رسائی ہوں۔

ان تعارفی کتب پر کچھ وقت صرف کریں، کیونکہ قلعۂ دانش کے ان مبہم اور بلند پایہ شاہکاروں کو حاصل کرنے کی خاطر آپ کو طویل محاصرہ لگانا ہوگا۔ اگر انہیں ہضم کرنے میں مشکل پیش آئے تو فہرست میں شامل کچھ آسان نوالے بطور مصالحہ استعمال کریں: مثلاً پلوٹارک، یا عمر خیام، یا جارج مور، یا رابلیس، یا ایلن پو (نمبر 16، 31، 32، 45 اور 91)؛ دراصل گروپ X اور XI میں شامل زیادہ تر کتب بطور بھوک افزا کام کریں گی یا دیگر کتب سے ذہنی بوجھ محسوس ہونے پر راحت دیں گی۔

حتیٰ کہ ابتدا میں ویلز بھی کچھ پھیکا لگے گا؛ آپ اس کے رینگنے والے جانوروں اور مچھلیوں، اس کے کرومینن اور نینڈرتھل انسانوں سے اکتا جائیں گے۔ لیکن ہمارے لیے ان ارضیاتی ادوار سے گزرنا لازمی اور آثار قدیمہ اور بشریاتی ماخذوں کی جھاڑیاں ہٹا کر راہ تلاش کرنا ضروری ہے: ہم ان ممنوعہ الفاظ پر اپنے دانت تیز کرتے ہیں، ہم مشکل گرہیں دانتوں سے کھولتے ہیں اور کچھ بھی سہنے کی سکت پیدا کرتے ہیں۔ اگر ہم بہادر کے ساتھ ساتھ کچھ خوش حال بھی ہیں تو ایک باسہولت سی لغت خرید لیں گے، مثلاً ویبسٹر کی کالجیئیٹ (ضخیم لغات سے پرہیز کریں جن کا حجم

استعمال کی حوصلہ شکنی کرتا ہے)،اور ایک دیوار کو کسی کشادہ سے نقشۂ دنیا سے سجا دیں گے، تاکہ نئے الفاظ اور پرانے مقامات ہمارے لیے کچھ با معنی بن جائیں۔ ویلز کے باب ختم ہو جانے پر Sumner کی ''Folkways'' ایک دل موہ لینے والا صحرا ہوگا؛ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک پروفیسر سوشیالوجی کو اس قدر مسحور کن بنا سکتا ہے۔

کیا آپ جاننا چاہتے ہیں کہ مذہب کی ابتدا کیسے ہوئی، اور یہ توہمات سے فلسفے کے درجے تک کیسے پہنچا؟ جیمز جارج فریزر کی ''Golden Bough'' / شاخِ زریں پڑھیں، یہاں ایک عظیم محقق نے اپنی زندگی بھر کی عرق ریزی کو ایک جلد میں مجتمع کر دیا ہے جس پر برطانوی حکومت نے اپنی ہی عزت افزائی کرتے ہوئے اسے قلمرو کا ایک نائٹ عطا کیا۔ اگر چاہیں تو کچھ حصہ چھوڑ دیں: ہر پیراگراف میں سے کچھ اخذ کرنے کا فن سیکھیں؛ عموماً اس کے آغاز میں موضوع پر مشتمل جملہ ہوتا ہے جس میں مصنف ایک مفروضہ پیش کرتا اور پھر اسے ثابت کرنے کی امید رکھتا ہے، اور اگر یہ تھیسس آپ کے استعمال یا دلچسپی کا نہ ہو تو اگلے یا اس سے اگلے موضوع پر چلے جائیں، یہاں تک کہ خود کو مصنف کے ساتھ ہم کلام محسوس کرنے لگیں۔ یہ زبردست کتاب مکمل ہونے پر آپ کی تعلیم کا بوجھل ترین حصہ ختم ہو گیا؛ باقی کام دیوتاؤں کے ساتھ ایک ایڈونچر جیسا ہوگا۔

ابھی تک ہماری فہرست تاریخی بنیاد پر مرتب شدہ کیوں ہے؟ اول، اس لیے کہ تاریخ کا حصہ بن کر جینا اور اسے بنانا بھی اتنا ہی اچھا ہے جتنا اس کا مطالعہ کرنا، تہذیب کی تمام سرگرمیوں کو یکجا رکھتے ہوئے — اقتصادی، سماجی، سیاسی، سائنسی، فلسفیانہ، مذہبی، ادبی اور آرٹسٹک؛ اپنے راستے میں ہم موزوں موقعے پر ادب، فلسفے یا آرٹ کی ہر کتاب پر نظر ڈالیں گے اور اس کے ماخذ اور وقعت کو زیادہ بہتر انداز میں سمجھیں گے — تناظر ہی سب کچھ ہے۔ دوم، چونکہ اس انتظام کی وجہ سے کچھ نہایت مسرت انگیز اور تفریح بخش شاہکار عمیق النظر ہدایاتی کتب کے ساتھ باری باری آئیں گے؛ یہ انہضام میں مددگار ثابت ہوگا۔ چنانچہ ویلز کی کچھ مزید تحریروں اور شاندار تاریخ یورپ ''The Human Adventure'' میں اور مصر کے متعلق بریسٹڈ کا کامل باب پڑھنے کے بعد برائن براؤن کا کیا ہوا کنفیوشس، لاؤزے اور مینیئس کے اقوال کا انتخاب پڑھنا خوش گوار

لگے گا۔ پھر بائبل کی سلاست اور خوب صورتی، آرٹ کے متعلق Faure کی فصیح البیانی اور ڈاکٹر ولیمز کی دلچسپ ''History of Science'' راحت انگیز معلوم ہوں گی (اگر موخر الذکر نایاب اور زبردست کتاب نہ مل سکے تو اس کے بجائے Dampier-Whetham کی ''History of Science'' یا Ginzburg کی ''The Adventure of Science'' پڑھیں)۔ ان بھرے ہوئے سمندروں سے گزر کر ہم انجام کار یونان کے ننھے جزیروں پر آتے ہیں۔

یہاں جینیئس بکثرت موجود ہے؛ ہم اپنی مختصر سی فہرست میں اتنے سارے دیوؤں کو کیسے سموئیں گے؟ آیئے گائیڈ سے مدد لیتے ہیں: بریسٹڈ اور ویلز ہمیں زیادہ بڑی یادگاریں دکھائیں گے، پروفیسر Bury ہم پر یونانی سیاست کی پیچیدگیاں منکشف کرے گا، اور گلبرٹ مرے آج تک لکھے گئے عظیم ترین ادب سے متعارف کروائے گا۔ اور پھر خود جینیئس آئیں گے: ہیروڈوٹس اپنی مسرت بخش کہانیوں کے ساتھ جو ہمیشہ ہی درست نہیں؛ تھیوسی ڈائیڈز اپنی حقیقت پسندانہ سوچ اور کلاسیکی انداز کے ساتھ (مشہور ''Funeral Oration'' پیریکلیز کے لیے تھیوسی ڈائیڈز نے کتاب 11، باب 6 میں لکھی تھی)؛ پلوٹارک سوانحات کے ساتھ جو Bury کے ہاں دفن ناموں کو ہماری یادوں کے سٹیج پر زندہ کر دیں گی؛ ہومر دیوتاؤں اور سورماؤں، ہیلن اور پینی لوپی کے لہکتے ہوئے گیتوں کے ساتھ؛ دیوقامت ایسکائی لس پرومیتھیئس کی تصویر کشی کے ساتھ جو پابند سلاسل اور بدستور سرکش ہے؛ سوفوکلیز دکھ سے حاصل کردہ رحیم دانش کے ساتھ؛ اور ''یوری پیڈیز الانسان،'' اپنے دشمنوں کی بدنصیبیوں پر نوحہ کناں اور آخر میں حتیٰ کہ دیوتاؤں کو بھی معاف کرتا ہوا۔

یہاں یورپی فلسفے کا اولین اور عظیم ترین عہد موجود ہے: لیرٹیئس کا ڈایوجینز ہمیں شہید سقراط اور مصلح افلاطون، خندہ زن فلسفی ڈیما کریٹس اور انسائیکلوپیڈیائی ارسطو، رواقی ژینو اور اپی قوریت کے بانی (مگر جو خود اپی قوری نہیں تھا) اپی قورس کی کہانی سناتا ہے۔ افلاطون گویا ہوتا اور اپنی کامل ریاست کی تصویر کشی کرتا ہے؛ بے داغ منطقی ارسطو زریں اصولوں کی تبلیغ کرتا اور یونان کی امیر ترین لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔ ولیمز نے اس کہانی کو لے کر بتایا کہ کس طرح سائنس نے توہم پرستی کی جگہ لی؛ کس طرح بقراط آیا اور کئی صدیوں بعد ''بابائے طب'' بنا؛ اور کیسے ارشمیدس آرٹ

اور جنگ کی ابدی مقابلہ بازی کی علامت بنا اور اپنے تھیورم حل کر رہا تھا کہ ایک سپاہی نے اسے خنجر مار کر ہلاک کر دیا۔ سب سے آخر میں Elie Faure ہمیں فیدیاس کے شانہ بشانہ کھڑا کرتا ہے جو مہیب صبر و استقامت کے ساتھ پارتھینون کے لیے مجسمے تراشتا ہے، اور پراکسٹ لیز چھینی سے ایفروڈائٹی کا کامل حسن نکھارتا ہے۔ ایسا دور پھر کب دیکھنے کو ملے گا؟

ان یونانیوں کو سمجھنا بذات خود ایک طرح کی تعلیم ہوگی، اور درحقیقت ایک ماہر تعلیم نے 100 خوش قسمت طلبا کو دو سالہ کورس میں یونانی تہذیب مکمل گہرائی کے ساتھ پڑھانے کا تجربہ بھی کیا ہے۔ اہل روم نے ہمیں اتنا کچھ نہیں دیا۔ اگرچہ انہوں نے قابل تعریف طور پر جدید یورپ کی اقوام کے لیے سماجی تنظیم اور سیاسی تسلسل کی بنیادیں رکھی تھیں، لیکن انہوں نے قوانین اور جنگوں، سڑکوں اور نالیوں کی تعمیر اور ارد گرد منڈلاتے بربریوں کو بھگانے میں اپنا اتنا زیادہ کچھ کھو دیا کہ ان کی زندگیوں سے پرسکون فکر چھن گئی جو ادب، فلسفے اور آرٹ میں جلوہ گر ہوا کرتی ہے۔ پھر بھی یہاں دیوتا موجود ہیں: شاید آج تک کا عظیم ترین ریاست کار جسے پلوٹارک کے فن نے خوش گوار بنایا؛ مردانہ وجاہت کی حامل شاعری میں ''اشیا'' کی ناگزیر فطرت پر غور و فکر کرتا ہوا افسردہ لوکریٹیئس؛ اپنے ملک کے افسانوی ماضی کی زربافی کرتے ہوئے ورجل کی چہکار؛ اور رومنوں میں سے آخری، مارکس آریلیئس، ایک لاثانی تخت پر بیٹھا شہوت اور طاقت کے مصنوعی پن پر مراقبے میں مصروف۔

یہ ایک شان دار اور المناک کہانی ہے، کیسے یہ دیو پرشکوہ انداز میں سارے کرۂ ارض پر پیر پھیلائے کھڑا تھا، اور پھر بدعنوانی اور غلامی نے آہستہ آہستہ گھن کی طرح چاٹ لیا، حتیٰ کہ باہر سے بربری افواج اور اندر سے مشرقی مسالک نے اسے تباہ کر ڈالا۔ عظیم ترین مورخ ایڈورڈ گبن اپنی ''The Decline and Fall of the Roman Empire'' کا شاہانہ بیان یہیں سے شروع کرتا اور پھر اپنی زوردار غنائی نثر میں بربادی کا حال پیش کرتا ہے۔ آیئے جھرنوں جیسے ان صفحات کو سکون سے پڑھیں: زندگی اتنی اہم نہیں کہ ہم تاریخ نویسی کرتے ہوئے اس فلسفی کے لیے کچھ فرصت نہ نکال سکیں۔

گبن نہایت فراخ دلی سے محض روم کی مرگ کی ہی نہیں بلکہ شمالی یورپ کی شیر خواری (قرون وسطیٰ) کی کہانی بھی سناتا ہے۔ یہاں پاپائیت مغربی ریاست کاری کے عظیم ترین خواب کی تعبیر بنی ۔یورپ کا اتحاد؛ یہاں قسطنطین نے مذہب بدلا اور شارلیمان کی تاج پوشی ہوئی؛ یہاں عربوں کی جوشیلی افواج کے ہاتھوں تباہی کی داستان رقم ہے جو افریقہ اور سپین پر چھا گئے، بغداد و قرطبہ کی تہذیب تعمیر کی، اور جب انہی جیسے بربری ترکوں نے قفقاز کے راستے انتشار زدہ مغرب پر دھاوا بولا تو واپس صحرا میں چلے گئے۔ میمونائیڈز اور عمر خیام بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کے ماتحت یہودی اور اہل فارس کیسے پھلے پھولے۔ ولیمز کے ہاں ہمیں قابل فخر ریکارڈ ملتا ہے کہ مسلمانوں نے ریاضی اور طب، فلکیات اور فلسفے میں کیسے کمالات دکھائے، اور Faure ہمیں غرناطہ کے الحمبرا اور ہندوستان کے تاج محل میں بے مثال اور نفیس فن تعمیر دکھائے گا۔

لیکن اس زمانے میں چند ایک مسیحی بھی تھے۔ رابنسن نے ''The Human Adventure'' شروع کی اور ان کی تہذیب کو اس قدر بہتر طریقے سے بیان کیا کہ ہم اسے فہرست میں شامل کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ دانتے اور چوسر اُس عہد کو انجام تک پہنچاتے ہیں۔ ''Canterbury Pilgrims'' ایک پرہیز گار مشن ہونے کے باوجود ابلیس کی تحریروں جیسی چلبلی کہانیوں سے بھری پڑی ہے؛ اور دانتے اپنے کلیسیا کے خلاف برسرِ جنگ ہوتے ہوئے بھی اس کی الٰہیات کو ایسی شان و شوکت اور عظمت تک سرفراز کرتا ہے کہ کچھ دیر کے لیے ہم ''جہنم'' کی خالق بربریت کو بھول جاتے ہیں۔ ایبے لارڈ کو اس الٰہیات پر شک تھا، لیکن وہ اچانک اپنی مردانگی کھو بیٹھا اور دباؤ ڈالنے کے قابل نہ رہا؛ انسانیت اور قابل ترس حالت کی مثال ہیلوائزے اور شک کو تیاگ دینے سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے؟ اگر آپ کو معلوم کرنا ہے کہ ہمارے بے طرح زمانے میں بھی انگلش نثر کامل ہو سکتی تھی تو اس لافانی محبت کے متعلق جارج مور کا بیان پڑھیں۔ ہنری ایڈمز بھی ''Mont St. Michel and Chartres'' میں ہمیں یہ کہانی سناتا اور سینٹ تھامس آکوینس کی انسائیکلوپیڈیائی راسخ العقیدگی کی تشریح کرتا ہے (عظیم فرانسیسی گرجا گھروں کے ذاتی دورے میں پیش آنے والے واقعات کے طور پر)؛ یہاں گوتھک کو انگلش بلوائی گئی ہے اور وہ حتیٰ کہ امریکیوں پر بھی خود کو منکشف کرتا ہے۔

یہیں پر ہمیں اُس سراہی نہ گئی رفعت سے پالا پڑتا ہے، Taine کی ''ہسٹری آف انگلش لٹریچر'': ایسے محققانہ انداز میں تیار کی گئی اور شاندار انداز کی حامل کتاب کہ جسے گبن کے پہلو میں رکھا جا سکتا ہے؛ آخرکار ایک فرانسیسی نے ان کے ادب کی وضاحت انگلش میں کی۔

آخر میں ہم قرون وسطیٰ کی مردانگی سے بھرپور مالیخولیائی موسیقی سنتے ہیں، اور جارجیائی بھجن اپنی رواں شوکت کے ساتھ ہمیں گھیر لیتے اور عمق عطا کرتے ہیں۔ اس حوالے سے سیسل گرے کوئی کامل راہنما نہیں، وہ تو بس ایک خلاصہ پیش کرتا ہے، اور موسیقی کو اعلیٰ ترین فلسفے کے طور پر پسند کرنے والے لوگ اس موقعے پر ہماری فہرست سے انحراف کریں گے اور آکسفورڈ '' History of Music '' کی جلد نمبر چار، پانچ اور چھ کا مطالعہ کریں گے۔ بقول نٹشے، موسیقی کے بغیر زندگی ایک خطا ہوگی۔

پھر قرونِ وسطیٰ بھی گزر گئے۔ تب ہم یکدم قرونِ وسطیٰ کے آرٹ اور فکر کی بھرپور صورت کے سامنے آن کھڑے ہوتے ہیں: اطالوی نشاۃ ثانیہ۔ مسٹر ویلز ہمیں چند ناکافی صفحات میں ایک خاکہ پیش کرتا اور سات کشادہ اور حیران کن جلدوں کے ساتھ اکیلا چھوڑ دیتا ہے تاکہ جان ایڈ لنگٹن سائمنڈز ہماری راہنمائی کرے۔ اس نے مسیحی عہد کے اس عظیم ترین دور سے ہی اپنی مریضانہ زندگی کی ہر سانس اور اخلاقیات کا معیار مستعار لیا تھا۔ (اگر آپ کی عمر ابھی اتنی نہیں کہ اس قدر دور تک سفر کر سکیں تو Burckhardt کی واحد جلد ''The Renaissance in Italy'' پڑھ لیں؛ اگر آپ نے سنبھل کر عجلت کرنا سیکھا ہے تو Burckhardt اور سائمنڈز کو بھی پڑھیں)۔ یہاں ایک بار پھر جینیئس کا جھمگٹا لگا ہے: فلورنس میں ہم میڈیچی کے محل میں داخل ہوتے ہیں جہاں پیکو ڈیلا میرانڈولانو دریافت شدہ افلاطون کے مجسمے کے حضور شمعیں روشن کر رہا ہے، اور مائیکل اینجلو نامی لڑکا بے دانت Faun کا پیکر تراشنے میں مصروف ہے؛ روم میں ہم جولیئس دوم اور لیو دہم کے ہمراہ ویٹیکن کے فرشوں پر چلتے اور انہیں کلیسیا کی دولت اور شاعری کی مدد سے ہر آرٹ کو مہمیز اور ترقی دیتے دیکھتے ہیں۔ وازاری ہمارے سامنے بوٹی چیلی، برونیلیشی، لیونارڈو، رافیل اور اینجلو کے سٹوڈیوز کھولتا ہے؛ Faure پینٹنگ، مجسمہ سازی اور تزئین کے اِس بے مثال نکھار اور بانکپن پر

غنائی نثر کے موتی بکھیرتا ہے؛ میکیاویلی سیزر بورجیا کو سامنے رکھ کر مثالی بادشاہ کی تصویر کشی کرتا ہے؛ چیلینی گاہے بگاہے قتل گری ترک کر کے اپنا ''پرسیئس'' ڈھالتا یا ایک کامل گلدان بناتا ہے؛ برونو اور وانینی دنیا کو عقل کی مدد سے سمجھنے کے لیے انسان کی کوششوں میں نئی روح پھونکتا ہے؛ کاپرنیکس، ویسالیئس اور گلبرٹ جدید سائنس کے سنگ ہائے بنیاد رکھتے ہیں؛ اور پیلسٹرینا ہمیں نغموں کے پنکھ پہ بٹھا کر بلندی پر لیجاتی ہے۔ ہمارے سامنے ایک عظیم عہد جلوہ گر ہے۔

لیکن سرد دنیا اور سخت گیر شمال سے تعلق رکھنے والا لوتھر دھوپ بھری اٹلی کے بے راہرو آرٹ کو پسند نہیں کرتا، اور بلند بانگ انداز میں کلیسیا کو قدیم مرتاضیت اور سادگی کی جانب واپس لیجانے کے لیے آواز اٹھاتا ہے۔ جرمنی کے راجے مذہبی بغاوت کو اپنی پالیسی میں بطور ہتھیار استعمال کرتے ہوئے اپنی پھیلتی ہوئی اقالیم کو پاپائیت سے الگ کر لیتے، بہت سی خود مختار ریاستیں بناتے اور اُس شاہی قوم پرستی کا آغاز کرتے ہیں جو عہد اصلاح سے لے کر انقلاب تک یورپی تاریخ کو پروئے ہوئے ہے۔ قومی شعور مذہبی ضمیر کی جگہ لے لیتا ہے، زہد کی جگہ وطن پرستی آ جاتی ہے اور ہر یورپی قوم کو اپنی اپنی نشاۃ ثانیہ کے لیے ایک ایک صدی ملتی ہے۔ یہ سیاسی رومانس کا عہد ہے: کیتھرائن ڈی میڈیچی اور ہنری ہشتم، چارلس پنجم اور فلپ آف دی آرماڈا، ایلزبتھ اور ایسیکس، سکاٹوں کی ملکہ میری اور اس کے بہت سے عاشق، اور ہیبت ناک آئیوان۔ یہ ادب میں دیو قامت شخصیات کا عہد ہے: فرانس میں رابلیس تمام احکامات اور اوصاف سے بغاوت کرتا ہے، اور مانٹینی عوامی و نجی امور کو آج تک لکھے گئے عظیم ترین مضامین میں زیر بحث لاتا ہے؛ سپین میں سروانتیز واحد بازو کے بل پر ہی مشہور ترین ناول لکھتا ہے، اور لوپے ڈی ویگا 1800 ڈرامے ضابطۂ تحریر میں لاتا ہے؛ لندن میں ایک قصاب کا بیٹا عظیم ترین جدید ڈرامے لکھتا ہے اور سارا انگلینڈ [بقول سپنسر] ''ہیئت اختیار کر لیتا ہے۔'' یہ جدید نفس کا عہدِ بہار ہے۔

محققین یہ کہنے میں بڑی رغبت دکھاتے ہیں کہ سپین، انگلینڈ اور فرانس میں غنچے چٹکنے پر یورپ کو ایک دھچکا پہنچا اور وہ نشاۃ ثانیہ کی بلند سطح سے نیچے گر گیا۔ ایک لحاظ سے یہ بات درست بھی ہے: سترہویں صدی مذہبی تصادم کا عہد ہے، تیس سالہ جنگ کا دور جس نے جرمنی کو برباد کر ڈالا

اور پیوریطانی انقلاب نے شاعری و آرٹ میں انگلینڈ کے وفور کو ایک صدی کے لیے موقوف کر دیا۔ اس کے باوجود اس صدی کے ناموں کی فہرست پر نظر ڈالیں۔ یہ ''Three Musketeers'' کا زمانہ ہے: ریشیلو اور مازرن جاگیرداروں اور نوابوں کے خلاف فرانس کی مرکزی حکومت کو مضبوط کرتے اور لوئس XIV کے لیے ترکے میں ایک متحد اور طاقت ور ریاست چھوڑ جاتے ہیں: وولٹیئر کے ماتحت فرانسیسی ثقافت کے نفیس پھول کے لیے تحفظ اور امن کا ایک منظم وسیلہ۔ لاروشے فوکو تھیئٹروں اور درباروں کی Cynicism کو کامل شکل عطا کرتا ہے؛ مولیئر ہجویہ انداز میں اپنے لوگوں کی منافقتوں اور فریب کاریوں سے لڑتا ہے، اور پاسکل جذبات سے بھرپور انداز بیان میں ریاضی اور زہد کو باہم ملا دیتا ہے۔ بیکن اور ملٹن انگلش شاعری کو بلند ترین سطح تک لیجاتے ہیں، اور ملٹن کچھ قابل درگزر شاعری بھی لکھتا ہے۔ یہ فلسفے میں زوردار نظاموں کا عہد ہے: انگلینڈ میں بیکن، ہوبز اور لاک؛ براعظم یورپ میں ڈیکارٹ، سپینوزا اور لیبنز۔ سائنس کے شعبے میں بھی یہ عہد عالی شان ہے: فلکیات میں گلیلیو، فزیالوجی میں سرولیم ہاروے، کیمیا میں رابرٹ بوائل، باقی ہر چیز میں سر آئزک نیوٹن۔ مصوری میں ستاروں کی پوری کہکشاں موجود ہے: ہالینڈ میں ریمبراں اور فرانز ہالز؛ فلینڈرز میں روبنز اور واں ڈائیک؛ فرانس میں پوساں اور کلاڈ لورین؛ سپین میں ایل گریکو اور ویلازکوئز۔ اور موسیقی میں باخ جنم لیتا ہے۔

جوہان سیباسٹیان باخ جوپیٹر سے قریب ترین اولمپیاؤں میں سے ایک ہے؛ اور آپ کو اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھنا چاہیے جب تک آپ کا جسم اور روح ''Mass'' کی مترجم شان سے دہل نہ جائیں۔ Arnstadt اور ہر جگہ کے بوڑھے باجانواز (جس نے شاہکار تخلیق کرنے کے علاوہ بیس بچے بھی پیدا کیے) کے ہاں موسیقی اپنی جڑواں فلک بوس انتہاؤں میں سے ایک تک پہنچتی ہے؛ دوسری اوج کا محرک دیوانہ بیتھوون تھا۔ اٹھارہویں صدی شان دار نغموں سے بھری پڑی ہے: ہینڈل Oratories پیش کرتا ہے، اور ہیڈن سوناٹا اور سمفنی تشکیل دیتا ہے؛ Gluck افی جینیا کی قربانی کے حوالے سے ایک یادگار نغمہ بناتا ہے، اور موزارٹ اپنی غمی اور خوشی کے تحت میٹھے سُروں کا ایسا تانا بانا بُنتا ہے کہ جس کے بعد کے تمام موسیقار بے ترتیب اور بے ہنگم لگنے لگے۔ اگر

آپ ''مطلق موسیقی'' کو جاننا چاہتے ہوں — ایسی موسیقی جو کہانیوں، یا تصویروں یا خیالات پر نہیں بلکہ اپنی ''بے معنی'' خوب صورتی پر انحصار کرے — تو کچھ دیر کے لیے اپنا ریڈیو بند کر دیں اور موزارٹ کی ''Andante'' بجا کر سنیں۔

لیکن یہاں ہم اٹھارہویں صدی میں کھڑے ہیں جسے کلائیو بیل تہذیب کے متعلق اپنی گرانقدر کتاب میں پیریکلیز کے عہد اور نشاۃ ثانیہ کے پہلو بہ پہلو رکھتے ہوئے ثقافت کی تاریخ کے تین اعلیٰ ترین ادوار کے طور پر بیان کرتا ہے۔ بربری جنگوں، تیزی سے ترقی پاتی ہوئی سائنس اور آزادی یافتہ فلسفے کا دور؛ نوابوں کی لوٹ کھسوٹ، عمدہ آداب اور نہایت حسین ملبوسات کا دور۔ جیسا کہ نپولین نے Talleyrand سے کہا، ''جن لوگوں نے 1789ء سے پہلے کا دور نہیں دیکھا وہ زندگی کی بھرپور مسرت سے آشنا نہیں ہوئے۔'' Sainte-Beuve کی ''Portraits'' میں ان مرصع آدمیوں کی زندگیوں کے متعلق پڑھیں؛ ان کی تصاویر Watteau اور Fragonard، رینالڈز، گینزبرو اور رومنے میں دیکھیں؛ اور پھر Taine اور کارلائل کے ہمراہ اگلی نشستوں پہ بیٹھ کر ان کے زوال کا آتش ناک ڈرامہ دیکھیں۔ کسی ایسے دور کا سوچیں جس میں گبن اور والٹیئر جیسے مورخین، ہیوم اور کانٹ جیسے فلسفی، فرانسیسی ''انسائیکلوپیڈیا'' جیسا کارنامہ، بوسویل جیسا سوانح نگار، جانسن، گولڈ سمتھ، گبن، برک، گیرک اور رینالڈز جیسا ادبی حلقہ، فیلڈنگ اور سٹرن جیسے ناول نگار، ایڈم سمتھ جیسے ماہرین معاشیات، جوناتھن سوئفٹ جیسا سنکی، میری وولسٹون کرافٹ جیسی خاتون موجود ہو!

تب انقلاب آتا ہے، اشرافیہ کی گردنیں قلم ہوتی ہیں، آرٹ اور آداب رخصت ہوتے ہیں؛ سچائی خوب صورتی کی جگہ لے لیتی ہے اور سائنس دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق نئے سرے سے بناتی ہے۔ رابنسن کے ذریعے اس صنعتی انقلاب کے بارے میں جانیں جس نے ہماری زندگیوں، ہماری حکومتوں، ہماری اخلاقیات، ہمارے مذاہب اور ہمارے فلسفوں کو یکا یک اور عمیق طور پر بدل ڈالا؛ یہ تاریخ کے عظیم دھڑوں میں سے ایک ہے۔ جس طرح اٹھارہویں صدی تھیوریٹیکل مکینکس اور فزکس کا عہد تھی اور اس کے بعد ان کی عملی فتح کا دور آیا، اسی طرح انیسویں صدی

تھیوریٹیکل حیاتیات کا عہد تھی، اور بیسویں صدی نے اسے فاتحانہ انداز میں عمل کرتے ہوئے دیکھا۔ ترقی اور انسان کی فطرت کے نئے تصورات سائنسی منظر پر چھا گئے، اور عقائد کی ایک جنگ چھیڑی جس نے مغربی ذہن کو منتشر اور ملول کر دیا ہے۔ اس صدی میں غیر کمال یافتہ روڈین کے باوجود مجسمہ سازی حقیر ہے، اور مصوری میں بہت سے مبہم تجربات کیے گئے، ٹرنر کے غروب آفتاب کے مناظر سے لے کر Whilstler کی بارش تک، لیکن موسیقی میں اس نے تاریخ کے ہر عہد کو پیچھے چھوڑ دیا۔

یہاں بیتھوون موجود ہے، صدی کے اختتام پر ابتدائی موزارٹی سادگی سے زور دار ''Eroica''، پانچویں سمفنی کی کاملیت اور ''Emperor'' کنسرٹو اور ''Kreutzer'' سوناٹا کی لطافت سے متاخر سوناٹوں اور ''Choral'' سمفنی تک آتا ہوا؛ یہاں شوبرٹ موجود ہے، غنائیت کا لامحدود خزانہ، جو اپنے بالا خانے میں سینکڑوں شاہکار بغیر گائے ہی چھوڑ گیا؛ یہاں خواب ناک Schumann موجود ہے، سچی یا افسانوی عمدہ ترین عاشقانہ داستانوں میں سے ایک کا مرکزی کردار؛ یہاں جوہانز براہمز ہے، دیکھنے میں قصاب جیسا لیکن فرشتوں جیسی موسیقی ترتیب دیتا ہوا، جس نے شومان کے کسی بھی نغمے سے زیادہ عمیق نغمے تخلیق کیے اور اس کی یاد سے اتنا مخلص رہا کہ دیوانے موسیقار کی بیوہ (اپنے دور کی عظیم ترین خاتون پیانو نواز) کے ساتھ پرخلوص محبت میں زندگی گزارنے اور چالیس سال تک اسے تحفظ دینے کے باوجود شادی کی درخواست کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔ یہ کیسی اذیت ناکی کی سلطنت ہے۔۔۔ آخری وقت میں مقدر کو مکا دکھاتے ہوئے بیتھوون سے لے کر خمار آلود شوبرٹ اور مجنون شومان، تپ دق میں مبتلا رچرڈ واگنر تک! (جینیئس اور جعل ساز، جس نے نصف صدی تک ذلتیں برداشت کیں اور پھر جرمن بادشاہوں اور شہزادوں کو زیر کر لیا)۔ مینڈل سوہن زیادہ مسرور تھا جس نے اپنی رحم دلی اور سادہ لوحی کی وجہ سے زیادہ تکلیف نہ اٹھائی؛ اور Liszt جس نے شہرت کے جام کا آخری قطرہ تک پی لیا یہاں تک کہ اس کی زندگی رفعت سے مخمور ہو گئی؛ اور Rossini جس نے سویاں بنانے کو ''The Barber of Seville'' ترتیب دینے پر ترجیح دی، اور جینیئس Verdi جس نے یورپ کے ہر اوپیرا ہاؤس میں

ایک barrel-organ رکھ دیا۔ لیکن جب ہم روس پہنچتے ہیں تو خبط کے تار دوبارہ بجنے لگتے ہیں: شکستہ Moussorgsky موت کا گیت گاتا ہے، اور دردناک Tschaikowsky اوپیرا کی وینس کے قدموں میں دل ہار کر زہر نوش کر لیتا ہے (ہمیں اس بات پر یقین کر لینا چاہیے کیونکہ تمام قابل احترام مورخین اس کی تردید کرتے ہیں)۔

بدیہی طور پر حسن دکھ سے جنم لیتا ہے، اور دانش غم کی اولاد ہے۔ ہماری موجودہ خالق صدی کے فلسفی بھی تقریباً موسیقاروں جیسے ہی ناخوش تھے: ان کا آغاز شوپنہاور سے ہوا جس نے دکھ کا ایک انسائیکلوپیڈیا لکھ ڈالا، اور آخر میں نٹشے آتا ہے جس نے اپنی زندگی کو اس کی المناکی کی وجہ سے چاہا، لیکن یہ سوچ کر دیوانہ ہو گیا کہ شاید دوبارہ زندہ ہونا پڑے۔ ایک مرتبہ پھر مفلوج Buckle کو دیکھنا کس قدر دردناک ہے جس نے اپنی زندگی میں صحت مندی کا ایک لمحہ تک نہ دیکھا اور اپنی ''History of Civilization in England'' کا دیباچہ بھی مکمل کرنے سے پہلے 41 سال کی عمر میں مر گیا! انیسویں صدی کے تمام جینئس افراد میں واحد صحیح الدماغ آدمی بوڑھا گوئٹھے تھا جس نے زیادہ عرصے تک جی کر شیلی سے اختلاف کیا۔ Eckermann کی ''Conversations with Goethe'' پڑھیں اور خود کو ہفتے بھر کے لیے ایک پختہ ذہن کی صحبت میں خیال کریں۔ ''Faust'' کا حصہ اول پڑھیں، لیکن ادب کے کسی مورخ — حتیٰ کہ Brandes — کی باتوں میں آ کر حصہ دوم نہ پڑھیں: یہ بے تک باتوں کا بے ہنگم مجموعہ ہے جو صرف ایڈورڈ ڈیلیئر کے لائق ہیں۔ اس دور میں گوئٹھے کا ہم پلہ واحد دوسرا ذہن نپولین کا تھا، تخیل، توانائی اور عزم کا طاقت ور آلہ؛ لڈوگ سے اس کی کہانی سنیں اور پھر ''The Modern Regime'' میں 90 جھلملاتے ہوئے صفحات پڑھیں جن میں Taine کورسیکائی جینئس کا تجزیہ کرتا ہے۔

بائرن کے متعلق Taine کے باب کا ہر لفظ اپنے اندر جذب کر لیں اور پھر Childe Harold کی ''Pilgrimage''، ''Cain'' اور ''Don Juan'' کے دو تین کینٹوز پڑھیں۔ کیٹس کے قصے پڑھنا نہ بھولیں: وہ انگلش زبان کی عمدہ ترین نظمیں ہیں۔ ورلین اور De Musset ہماری فہرست سے باہر رہ گئے کیونکہ کوئی ترجمہ ان کی ملال انگیز غنائیت کا احاطہ نہیں کر سکتا، اور ہائنے کو شامل کیا گیا

حالانکہ اس کی شاعری کی نکتہ رسی اور موسیقی کو ایک سے دوسری زبان میں منتقل کرنے کی ہر کوشش ناکام ہوئی۔ ٹینی سن "In Memoriam" اور "Idylls of the King" کے ساتھ داخل ہوتا ہے، لیکن ہمت ساتھ نہ چھوڑے تو اس کی جگہ تھامس میلوری کو دی جائے گی جس کی "Morte d'Arthur" انگلش نثر کی ایک شاہانہ یادگار ہے۔ کتابوں کی یہ صدی مکمل ہونے پر بالزاک میں سے آپ کو کافی کچھ پڑھنا ہو گا، کیونکہ وہ تقریباً زندگی جتنا ہی بصیرت افزا ہے۔ "Les Miserables" کو چھوڑ دیں، لیکن فلوبیئر کی دو شاہکار تحریروں ("مادام بوواری" اور "سالامبو") کا ایک لفظ بھی نہ چھوڑیں؛ یہاں فہرست میں اسے گروپس میں رکھتے وقت ایمان داری سے کام نہیں لیا گیا کیونکہ ایک پبلشر نے مکاری دکھاتے ہوئے فلوبیئر کی زیادہ تر تحریریں ایک ہی جلد میں اکٹھی کر دیں۔ اس کے بعد آپ اناطولی فرانس کی جانب سے پیش کردہ لطافتوں کا ذائقہ چکھتے ہیں جو فرانسیسی ثقافت اور آرٹ کا کشید کیا ہوا عرق ہے؛ صرف "Penguin Isle" کا نام لکھا گیا، لیکن اگر آپ حسن اور نزاکتِ گفتار کے عاشق ہیں تو اناطولی کی پوری بیس جلدیں پڑھ ڈالیں گے۔ "Pickwick Papers" اور "Vanity Fair" کو لیں (یا "ڈیوڈ کاپرفیلڈ" اور "ہنری ایسمنڈ" کو لیں) اور وکٹوریائی عہد کے بارے میں ہمارے انانیت پسندانہ تحقیر آمیز خیالات بھول جائیں: پہلے اپنے عہد کو ادب میں اس کی ہمسری کرنے دیں؛ اس کے بعد ہی ہم کوئی پتھر مار سکتے ہیں۔

انگلینڈ سے سکینڈے نیویا جائیں اور — ابسن کے دیگر ڈراموں کو نظر انداز کرتے ہوئے — "فاؤسٹ" کے بعد لکھی گئی عظیم ترین نظم "Peer Gynt" پڑھیں۔ آگے روس جائیں، ترگنیف کی کاملیت کا ذائقہ چکھیں، ٹالسٹائی کی "جنگ اور امن" کے کوہستانی سلسلے میں بلا عجلت بھٹکیں (اس کے کل صفحات صرف 1700 ہیں) اور انجام کار خود کو عظیم ترین ناول نگار دستوئیفسکی کے حوالے کر دیں۔ یہاں پھر ہر جلد بیش بہا ہے؛ اگر آپ انسانی مکاشفے کو نہایت گہرائی تک جاننا چاہتے ہیں تو نہ صرف "Brothers Karamazov" بلکہ "جرم و سزا"، "ایڈیٹ" اور "The Possessed" بھی پڑھیں گے۔ اس کے بعد آپ امریکہ کا رخ کر سکتے ہیں۔

کیا یہ فہرست کچھ امریکی ہیروز کی تحقیر کرتی ہے؟ لیکن اپنی جوانی کا زمانہ یاد کریں: امریکی

لوگ حال ہی میں پہل کاری سے کمرشل ازم کی جانب آنا شروع ہوئے ہیں، اور ابھی کمرشل ازم سے نکل کر آرٹ میں ابھرنے کا آغاز ہی کر رہے ہیں؛ ابھی تک وٹمین امریکیوں کا واحد دیو ہے۔ تھورو ہر بھرپور زندگی میں ایک مرحلہ ہے، فطرت کی طرف واپسی کے لیے ایک پکار جو آن کی آن میں مہذب بنائے جانے کے خلاف احتجاج کرنے والے ہر نوجوان کے خون میں دھڑکتی ہے۔ آج ایمرسن کافی پھیکا پڑ چکا ہے، اور اس میں بھی تھورو جتنی ہی ناتوانی ہے؛ لیکن اندازِ سخن کا مطالعہ کرنے والے لوگ ہفتے بھر کے لیے اس کے ساتھ قیام کرتے ہیں۔ ایڈگر ایلن پو کو ضرورت سے کچھ زیادہ اٹھایا گیا؛ موسیقیائی اور آسیبی قسم کی سطریں لکھنے والا شخص، دہشت ناک کہانیوں کا خالق جو ہماری بورژوازی کے ذوق اسراریت اور تصوراتی درد میں ہماری گھٹیا مسرت کوشی کو تسکین دیتی ہیں؛ ہم قائم مقام تکلیف سہ کر خوش ہوتے ہیں۔ ہم ایلن پو کو عظیم آرٹسٹ اس وقت کہتے ہیں جب ہماری مراد ہو کہ اس کی سوانح دلچسپ اور اور دکھ ہمارے لیے باعث کشش ہیں۔ طاقت ور کی نسبت کمزور سے محبت کرنا ہمیشہ زیادہ آسان ہوتا ہے؛ طاقت ور کو ہماری محبت نہیں چاہیے، اور ہم جبلی طور پر ان کی اشتعال انگیز کاملیت میں نقائص ڈھونڈتے ہیں؛ ہر مجسمہ مشتعل کرتا ہے۔

یوں ہم اپنی صدی تک پہنچتے ہیں، بجلی اور ''Gotterdammerung'' (دیوتاؤں کا دھندلکا) کا دور، عظیم دیوانگی اور دیوانے امن کا دور، تاریخ کے کسی بھی عہد کی نسبت زیادہ تیز رو اور زیادہ اساسی عقلی و اخلاقی تبدیلی کا دور۔ ہنری ایڈمز آپ کو ہمارے عہد کے رازوں سے آگاہ کرتا ہے؛ یہاں اس کی کوئی جگہ نہیں۔ غالباً برگساں کے پاس ایڈمز کا جواب ہے: ہماری یاسیت کی بنیادوں میں موجود مشینی انداز کا فلسفہ جو حیاتیات کا لازمی نتیجہ نہیں؛ شاید انسان بہرحال مشین تو نہیں۔ ہمارے زمانے کا عظیم ترین محقق ہیولاک ایلس ایک مشین سے بڑھ کر لگتا ہے؛ اور ہم اپنی صدی کا عظیم ترین ناول ''Jean Christophe'' پڑھتے ہیں، آرٹسٹ کا احساس ہمیں جکڑ لیتا ہے — لاچاری کا نہیں بلکہ تخلیق کا احساس۔ سپنگلر ہم سے مختلف ہے، اور کہے گا کہ ہماری تہذیب آمادۂ مرگ ہے؛ اگر ایسا ہے تو اس کی وجہ صرف طاقت کا شوق اور جنگ کی لت ہے جسے وہ شدت سے سراہتا ہے۔ رابنسن اور ویلز (یا اگر کچھ وقت ہے تو پروفیسر Fay) ہمارے سامنے پہلی عالمی جنگ

کے اسباب پیش کرتا ہے تا کہ ہم ان رقیبانہ رفعتوں کے گھٹیا پن اور مکروہ نتیجے کو واضح طور پر دیکھ سکیں، اور اپنے بچوں کو بھی پڑھوائیں تا کہ انہیں پتا چلے کہ جنگیں کیسے کی جاتی ہیں اور کس طرح انسان تین برس میں نوع انسانی کے قدم قدم طے کیے ہوئے سفر (تین ہزار برس میں، وحشت سے تہذیب تک) کو واپس لپیٹ سکتے ہیں۔

یہ کتابیں پر ملال ہیں، لیکن اپنی فہرست کے آخر میں پہنچنے تک ہم اتنے مضبوط ہو چکے ہوں گے کہ انیستھیز یا لیے بغیر سچائی کا سامنا کر لیں گے۔ شاید ہم اپنے تمام علم کے باوجود اب بھی یقین رکھتے ہوں کہ افلاطون اور لیونارڈو کو پیدا کرنے والی نسل کسی روز اتنی دانائی حاصل کر لے گی کہ آبادی پر قابو پا سکے، سمندروں کو تمام لوگوں کے لیے خوراک اور ایندھن لیجانے کی خاطر کھلا رکھے، اور تمام مارکیٹیں تمام تاجروں اور سرمائے کے لیے کھلی رہیں، اور یوں کوئی بین الاقوامی ادارہ انسانیت کو جنگ سے چھٹکارا دلا دے۔ نوع انسانی کی تاریخ میں اس سے بھی زیادہ عجیب وغریب کام ہو چکے ہیں؛ اس سے چالیس گنا بڑا اعجوبہ بھی مچھلی یا درندے سے کنفیوشس اور یسوع مسیح تک انسان کی ناقابل یقین ترقی کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ ہم نے ابھی آغاز ہی کیا ہے۔

تو یہ تھی ہماری کتب کہانی۔ یہ ایک اور دنیا ہے جس میں ایک سو پشتوں کے منتخب شاہکاروں کو رکھا گیا؛ اس میں غیر مشکوک دانائی اور ان دیکھے حسن کا خزانہ موجود ہے۔ زندگی ادب سے بہتر ہے، دوستی فلسفے سے شیریں تر ہے، اور بچے ہمارے دل میں کسی سمفنی سے زیادہ گہرائی تک پیوست ہوتے ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ جیتی جاگتی مسرتیں ہماری کتب کی منکسر اور ثانوی مسرتوں کی کوئی تحقیر نہیں کرتیں۔

جب زندگی تلخ ہو یا دوستی چھوٹ جائے، یا شاید ہمارے بچے ہمیں چھوڑ کر نئے مسکن اپنا لیں تو ہم شیکسپیئر اور گوئٹے کے ہمراہ میز پہ بیٹھیں گے، ہم رابلیس کے ہمراہ دنیا پر خندہ زن ہوں گے، اور جان کیٹس کے سنگ اس کے پت جھڑ کا حسن دیکھیں گے۔ کیونکہ یہی دوست ہمیں اپنا بہترین خزانہ دیتے ہیں، جو بدلے میں کبھی کچھ نہیں مانگتے اور ہمیشہ ہماری آواز پر لبیک کہنے کو تیار رہتے

ہیں۔ ان کے ہمراہ تھوڑی چہل قدمی کر لیں تو ہماری کمزوریاں دور ہو جائیں گی اور ہم تفہیم کی بدولت حاصل ہونے والی طمانیت سے آشنا ہوں گے۔

کتابیں

تعلیمی مقاصد کے تحت ایک سو بہترین کتب کی فہرست

GROUP I. INTRODUCTORY

1. THOMSON, J. A., The Outline of Science. 4V.
2. CLENDENING, LOGAN, The Human Body.

*3. KELLOGG, J. H., The New Dietetics; pp. 1-531, 975-1011.

4. JAMES, Wm., Principles of Psychology. 2v.

*5. WELLS, H. G., The Outline of History; chapters 1-14.

6. SUMNER.W. G., Folkways.
7. FRAZER, SIR JAS., The Golden Bough.

GROUP II. ASIA AND AFRICA

*8. BREASTED and ROBINSON, The Human Adventure. 2v.Vol. I, chs. 2-7.

5. WELLS, chs. 15-21, 26.
9. BROWN, BRIAN, The Wisdom of China.

*10. The Bible: Genesis; Exodus, Ruth, Esther, Job, Psalms, Proverbs, Ecclesiastes, Song of Solomon, Isaiah, Amos, Micah, the Gospels, Acts of the Apostles, and Epistles of Paul.

*11. FAURE, ELIE, History Of Art. 4v. Vol. I, chs. 1-3; vol. II, chs. 1-3.

12. WILLIAMS, H.S., History of Science. 5v. Bk. I, chs. 1-4.

GROUP III. GREECE

8. BREASTED and ROBINSON, vol. I, chs. 8-19.
5. WELLS, chs. 22-25.
13. BURY, J. B., History of Greece, 2v.
14. HERODOTUS, Histories. (Everyman Library.)
15. THUCYDIDES, The Peloponnesian War. (Everyman Library.)

*16. PLUTARCH, Lives of Illustrious Men (esp. Lycurgus, Solon, Themistocles, Aristides, Pericles, Alcibiades, Demosthenes, Alexander).

17. MURRAY, G., Greek Literature.

18. HOMER, Iliad. Trans. Bryant. Selections.
19. HOMER, Odyssey. Trans. Bryant. Selections.
20. AESCHYLUS, Prometheus Bound. Trans. Eliz. Browning.
21. SOPHOCLES, Oedipus Tyramus and Antigone. Trans. Young. (Everyman Library.).
22. EURIPIDES, all plays so far translated by Gilbert Murray.
23. DIOGENES LAERTIUS, Lives of the Philosophers.
*24. PLATO, Dialogues. Trans. Jowett. Esp. The Apology of Socrates, Phaedo, and The Republic (sections 327-32, 336-77, 384-85, 392-426, 433-35, 481-83, 512-20, 572-95). I-vol. ed. by Irwin Edman.
25- ARISTOTLE, Nicomacbean Ethics.
26. ARISTOTLE, Politics.
12. WILLIAMS, History of Science, bk. I, chs. 5-9.
11. FAURE, History of Art, vol. I, chs. 4-7.

GROUP IV. ROME

8. BREASTED and ROBINSON, vol. I, chs. 20-30.
5. WELLS, chs. 27-29.
16. PLUTARCH, Lives (esp. Cato Censor, Tiberius and Caius Gracchus, Marius, Sylla, Pompey, Cicero, Caesar, Brutus, Antony).
27. LUCRETIUS, On the Nature of Things. Trans. Munro. (Certain passages are admirably paraphrased in W. H. Mallock, Lucretius on Life and Death.)
28. VIRGIL, Aeneid. Trans. Wm. Morris. Selections.
*29. MARCUS AURELIUS, Meditations. (Everyman Library.)
12. WILLIAMS, bk. I, chs. 10-11.
11. FAURE, vol. I, ch. 8.
*30. GIBBON, E., Decline and Fall of the Roman Empire. 6v. (Everyman Library.) Esp. chs. 1-4, 9-10, 14, 15-24, 26-28, 30-31, 35 36, 44, 71.

GROUP V. THE AGE OF CHRISTIANITY

8. BREASTED and ROBINSON, vol. II, chs. 1-11.
5. WELLS, chs. 30-34.
30. GIBBON, chs. 37-38, 47-53, 55-59, 64-65, 68-70.
*31. OMAR KHAYYAM, Rubaiyat. Fitzgerald's paraphrase.
32. MOORE, GEO., Heloise andAbelard. 2v.
33. DANTE, Divine Comedy. Trans. Longfellow, or C. E. Norton.
*34. TA1NE, H., History of English Literature, bk. I.
35. CHAUCER, G., Canterbury Tales. (Everyman Library.) Selections.
36. ADAMS, H., Mont St. Michel and Chartres.

12. WILLIAMS, bk. II, chs. 1-3.
11. FAURE, vol. II, chs. 4-9.
37. GRAY, C., History of Music, chs. 1-3, 5.

GROUP VI. THE ITALIAN RENAISSANCE

5. WELLS, ch. 31.
38. SYMONDS, J. A., The Renaissance in Italy. 7V.
39. CELLINI, B., Autobiography. Trans. Symonds.
40. VASARI, G., Lives of the Painters and Sculptors. 4V. Esp. Giotto, Brunelleschi, Botticelli, Fra Angelico, Leonardo da Vinci, Raphael, and Michelangelo.
41. HOFFDING, H., History of Modern Philosophy. 2v. Sections op Bruno and Machiavelli.
42. MACHIAVELLI, N., The Prince.
37. GRAY, chs. 6, 8.

GROUP VII. EUROPE IN THE SIXTEENTH CENTURY

8. BREASTED and ROBINSON, vol. II, chs. 13-14.
43. SMITH, P., The Age of the Reformation.
44. FAGUET, E., The Literature of France; sections on the sixteenth century.
45. RABELAIS, Gargantua and Pantagruel.
*46. MONTAIGNE, Essays. 3V. (Everyman Library.) Esp. Of Coaches, Of the Incommodity of Greatness, Of Vanity, and Of Experience.
47. CERVANTES, Don Quixote.
*48. SHAKESPEARE:, Plays. Esp. Hamlet, Lear, Macbeth, Othello, Romeo and Juliet, Julius Caesar, Henry IV, Merchant of Venice, As You Like It, Midsummer Night's Dream, Timon of Athens, and The Tempest.
34. TAINE, bk. II, chs. 1-4.
37. GRAY, chs. 4, 7.
12. WILLIAMS, bk. II, chs.4-8...
11. FAURE, vol. III, chs. 4-6.

GROUP VIII. EUROPE IN THE SEVENTEENTH CENTURY

8. BREASTED and ROBINSON, vol. II, ch. 15.
44. FAGUET, sections on the seventeenth century.
49. LA ROCHEFOUCAULD, Reflections.
50. MOLIERE, Plays. Esp. Tartujfe, The Miser, The Misanthrope, The Bourgeois Gentleman, The Feast of the Statue (Don Juan).

*51. BACON, F., Essays. All. (Everyman Library.)
52. MI! TON, J., Lycidas, I! Allegro, 11 Penseroso, Sonnets, Areopagitica, and selections from Paradise Lost.
12. WILLIAMS, bk. II, chs. 9-13.
41. HOFFDING, sections on Bacon, Descartes, Hobbes, Locke, Spinoza, and Leibnitz.
53. HOBBES, Leviathan. (Everyman Library.)
54- SPINOZA, Ethics and On the Improvement of the Understanding. (Everyman Library.)
11. FAURE, vol. IV, chs. 1-4.
37. GRAY, chs. 9-10.

GROUP IX. EUROPE IN THE EIGHTEENTH CENTURY
8. BREASTED and ROBINSON, vol. II, chs. 16-21.
5. WELLS, chs. 26-27.
44. FAGUET, sections on the eighteenth century.
55. SA1NTE-BEUVE, Portraits of the 18th Century.
56. VOLTAIRE, Works. I-vol. ed. Esp. Candide, Zadig, and essays on toleration and History.
57. ROUSSEAU, J.]., Confessions.
58. TAINE, H., Origins of Contemporary France. 6v.Vols. I-IV.
*59. CARLYLE, The French Revolution, I-V. (Everyman Library.)
34. TAINE, History of English Literature, bk. III, chs. 4-7.
*60. BOSWELL, Life of Samuel Johnson. 2v. (Everyman Library.)
61. FIELDING, H., Tom Jones. (Everyman Library, 2v.)
62. STERNE, L., Tristram Shandy. (Everyman Library.)
*63. SWIFT, J., Gulliver's Travels. (Everyman Library.)
64. HUME, D., Treatise on Human Nature. 2v. (Everyman Library.) Esp. bks. II and III.
65. WOLLSTONECRAFT, MARY, Vindication of the Rights of Woman.
66. SMITH, ADAM, The Wealth of Nations. 2v. (Everyman Library.) Selections.
12. WILLIAMS, bk. II, chs. 14-15.
41. HOFFD1NG, sections on the eighteenth century.
11. FAURE, vol. IV, chs. 5-6.
37. GRAY, chs. 11-12.

GROUP X. EU.ROPE IN THE NINETEENTH CENTURY
8. BREASTED and ROBINSON, vol. II, chs. 22-28.

5. WELLS, chs. 38-39.
58. TAINE, Origins of Contemporary France. Vol. V, The Modern Regime pp. 1-90.
67. LUDWIG, E., Napoleon.
68. BRANDES, G., Main Currents of 19th Century Literature. 6v.
*69. GOETHE, Faust.
70. ECKERMANN, Conversations with Goethe.
71. HEINE, Poems. Trans. Louis Untermeyer.
34. TAINE, History of English Literature, bks. IV-V.
*72. KEATS, Poems.
*73. SHELLEY, Poems.
*74.. BYRON, Poems.
44. FAGUET, sections on the nineteenth century.
'75. BALZAC, Pere Goriot.
*76. FLAUBERT, Works. I-vol. ed. Esp. Mme. Sovary and Salambo.
77. HUGO, Les Miserables.
78. FRANCE, ANATOLE, Penguin Isle.
79. TENNYSON, Poems.
80. DICKENS, Pickwick Papers.
81. THACKERAY, Vanity Fair.
82. TURGENEV, Fathers and Children.
83. DOSTOIEVSKI, The Brothers Karamazov.
84. TOLSTOI, War and Peace.
85. IBSEN, Peer Gynt.
12. WILLIAMS, bks. III-IV.
86. DARWIN, Descent of Man.
41. HOFFDING, sections on the nineteenth century.
87. BUCKLE, Introduction to the History of Civilization in England. Esp part I, chs. 1-5, 15.
88. SCHOPENHAUER, Works. 1-Vol. ed.
89. NIETZSCHE, Thus Spake Zarathustra.
11. FAURE, vol. IV, chs. 7-8.
37. GRAY, chs. 13-17.

GROUP XI. AMERICA

*90. BEARD, C. and M., The Rise of American Civilization. 2v.
91. POE, Poems and Tales.
92. EMERSON, Essays.
93. THOREAU, Waldea.

*94. WHITMAN, Leaves of Grass.
95. LINCOLN, Letters and Speeches.

GROUP XII. THE TWENTIETH CENTURY
8. BREASTED and ROBINSON, vol. II, chs. 29-30.
5. WELLS, chs. 40-41.
96. ROLLAND, R. Jean Christophe. 2v.
*97. ELLIS, H., Studies in the Psychology of Sex. Vols. I, II, III, VI.
*98. ADAMS, H., The Education of Henry Adams.
99. BERGSON, Creative Evolution.
*100. SPENGLER, O., Decline of the West. 2v.

جن کتابوں کے نام پر * کا نشان لگا ہے انہیں خرید لینا چاہیے۔ کل 27 کتب پر نشان لگا ہے۔ سیکنڈ ہینڈ کتب کا سروے کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کی قیمت 90 ڈالر کے قریب بنتی ہے۔ فہرست میں شامل کل جلدوں کی تعداد 151 ہے جو اندازاً 300 ڈالر میں خریدی جا سکتی ہیں۔ ان کا مطالعہ کرنے میں اندازاً 4 سال (سات گھنٹے فی ہفتہ کے حساب سے) لگیں گے، یعنی فی جلد 10 گھنٹے۔

باب5

انسانی ترقی کی 10 چوٹیاں

سن 1794ء میں ایک نوجوان فرانسیسی ارسٹوکریٹ مارکوئس ماری ژاں ڈی کونڈورسیٹ گلوٹین کی سزا سے بچنے کی خاطر پیرس کے نواحی علاقے میں ایک مکان کے بالاخانے پر چھپا ہوا تھا۔ تنہائی میں (شاید اسے ڈر ہو کہ اگر کوئی دوست ملنے آیا تو راز فاش ہو جائے گا) اس نے انسان کی قلم سے لکھی گئی تمام کتب سے زیادہ رجائیت پسند کتاب لکھی: Esquisse d'un tableau des progres de l' esprit human ''(انسانی روح کی ترقی کے ایک ٹیبلو کا خاکہ)۔

اس نے فصیح انداز میں توہمات پرستی کی زنجیروں سے سائنس کی نئی حاصل کردہ آزادی کو بیان کیا اور نیوٹن کی کامیابیوں کو سراہا۔ اس نے لکھا: ''آزادی یافتہ علم اور ہمہ گیر مفت تعلیم کو ایک سو سال دے دیں تو تمام سماجی مسائل حل ہو جائیں گے......ترقی کی کوئی حد نہیں، ماسوائے اس کرے کی میعاد کے جو ہمارا مسکن ہے۔''

کونڈورسیٹ نے یہ مختصر سا مسودہ مکمل کرنے کے بعد اپنی میزبان کے حوالے کر دیا۔ تب وہ رات کی تاریکی میں کسی دور افتادہ گاؤں میں بھاگ گیا اور اپنا تھکا ہوا جسم ایک بستر پر ڈال دیا۔ آنکھ کھلنے پر اس نے خود کو پولیس کے نرغے میں پایا۔ اس نے اپنی جیب سے زہر کی شیشی نکالی (جو انجام کی امید میں ساتھ لیے پھر رہا تھا) اور آخری قطرہ تک حلق میں انڈیل لیا۔ کونڈورسیٹ اپنے صیادوں کی بانہوں میں ہی دم توڑ گیا۔

میں ہمیشہ حیران ہوتا ہوں کہ اس قسم کے حالات سے دوچار آدمی — امید کے آخری تنکے تک دھکیلا ہوا، تمام ارسٹوکریٹک مراعات قربان کرنے اور ساری دولت سے ہاتھ دھونے کے بعد — نے مایوسی اور افسردگی کی رزمیہ لکھنے کے بجائے ترقی کا قصیدہ کیسے لکھ ڈالا۔

اس سے پہلے کبھی انسان نے نوعِ انسانی پر اس قدر یقین نہیں کیا تھا، اور شاید بعد میں بھی کبھی نہیں کیا۔ سارے قدیم یونانی اور لاطینی ادب کو کھنگال لیں، مگر انسانی ترقی کے متعلق کوئی اثباتی یقین نہیں ملے گا۔ آخرکار مغرب ترقی — کے بخار — کا وائرس مشرق میں لایا، اور اس کے بعد ہی کسی ہندو یا چینی مفکر کے ہاں کسی نظریے پر یقین ملتا ہے کہ انسان برس گزرنے کے ساتھ ساتھ آگے کی جانب بڑھتا ہے۔ یہ انسانوں کے لیے ایک نسبتاً نیا تصور ہے۔

ترقی — ایک تعریف

''ترقی'' سے ہماری کیا مراد ہوگی؟ موضوعی تعریفیں کام نہیں آئیں گی؛ ہمیں چاہیے کہ ترقی کو ایک قوم یا ایک مذہب یا ایک ضابطۂ اخلاق کے حوالے سے تصور نہ کریں؛ مثلاً رحمدلی میں اضافہ ہمارے نشئے جیسے نوجوانوں کو نقصان پہنچائے گا۔ ہم ترقی کی تعریف مسرت کے حوالے سے بھی نہیں کر سکتے، کیونکہ احمق لوگ جینئس لوگوں سے زیادہ خوش ہیں، اور جن کی ہم سب سے زیادہ عزت کرتے ہیں وہ مسرت سے زیادہ عظمت کے متلاشی ہیں۔ کیا ہماری اصطلاح کی ایک معروضی تعریف ڈھونڈنا ممکن ہے؟ آیئے فی الحال ترقی کی تعریف ''ماحول پر زندگی کے بڑھتے ہوئے کنٹرول'' کے طور پر کرتے ہیں، اور ماحول سے ہماری مراد وہ 'تمام حالات ہیں جو خواہش کے

ارتباط اور حصول کو مشروط کرتے ہوں۔" ترقی بے ترتیبی پر ذہن اور مقصد کے غلبے، مادے پر ہیئت اور عزم کے غلبے کا نام ہے۔

ترقی کے حقیقی ہونے کے لیے متواتر ہونا لازمی نہیں۔ اس میں "سطح مرتفع،" تاریک عہد اور دل شکن رجعتیں موجود ہو سکتی ہیں، لیکن اگر آخری مرحلہ سب سے اعلیٰ ہو تو ہم کہیں گے کہ انسان نے ترقی کی ہے۔ اور ادوار و اقوام کی قدر پیمائی کرتے وقت ہمیں سوچ کے ڈھیلے ڈھالے انداز سے باخبر رہنا ہوگا۔ ہمیں چاہیے کہ نوخیزی کے دور سے گزرتی ہوئی اقوام کا موازنہ ثقافتی بلوغت کے خمار میں ڈوبی اقوام کے ساتھ نہ کریں، اور ایک عہد کے بدترین یا بہترین کا موازنہ مجموعی ماضی کی تمام منتخب بہترین یا بدترین چیزوں کے ساتھ نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ہم دیکھیں کہ امریکہ اور آسٹریلیا جیسے نوخیز ممالک میں غالب جینیئس کی قسم ایگزیکٹو، کھوجی اور سائنسی نوعیت کی ہے نہ کہ تصاویر یا نظموں کے مصور، مجسمے یا الفاظ تراشنے والی۔ ہمیں سمجھ آ جائے گی کہ ہر عہد اور مقام مخصوص قسم کے جینیئس کا ہی متقاضی ہوتا ہے، اور یہ کہ ثقافتی قسم صرف تبھی آ سکتی ہے جب اس کے عملی پیش روؤں نے جنگلات صاف کر کے راستہ تیار کر دیا ہو۔ اگر ہم دیکھیں کہ تہذیبیں آتی اور جاتی ہیں، اور انسان کے تمام کاموں کو فنا ہے، تو ہم موت کی ناقابل تردید حیثیت کا اقبال کر لیں گے اور اپنی زندگیوں یا اپنی قوموں کے دن کے دوران سست رفتاری سے آگے بڑھتے وقت ہماری ڈھارس بندھے گی، ہم آہستہ آہستہ اوپر کی طرف جائیں گے اور پہلے کی نسبت کچھ بہتر بنیں گے۔ اگر ہمیں پتا چلے کہ آج کے فلسفی چوڑے چکلے ارسطو اور وقیع النظر سقراط کے زمانے کی نسبت پست رتبہ رکھتے ہیں، کہ ہمارے مجسمہ گر ڈوناٹیلو یا اینجلو کے مقابلے میں کم تر ہیں، کہ ہمارے مصور ویلازکوئز، ہمارے شاعر اور نغمہ گر شیلی اور باخ کے سامنے ہیچ ہیں تو دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیے؛ یہ سب ستارے ایک ہی رات میں نہیں چمکے تھے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ آیا انسانی قابلیت کا کُل یا اوسط بڑھا ہے یا نہیں، اور آج اپنی اوج پر ہے یا نہیں۔

جب ہم ایک کُلی تناظر اپناتے اور اپنی جدید متزلزل اور انتشار زدہ ہستی کا موازنہ قدیمی لوگوں کی جہالت، توہمات، بہیمیت، انسان خوری اور بیماریوں سے کرتے ہیں تو کچھ تشفی ملتی ہے: ہماری

نسل کا پست ترین طبقہ شاید اب بھی ان لوگوں سے تھوڑا ہی مختلف ہوگا، لیکن ان سے اوپر لاکھوں کروڑوں لوگ ایسی ذہنی اور اخلاقی بلندیوں تک پہنچ گئے ہیں جس کا غالباً قدیم ذہن نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ شہری زندگی کے پر پیچ دھارے میں ہم کبھی کبھی تخیلاتی طور پر زمانۂ وحشت کی پرسکون سادگی میں پناہ لیتے ہیں، لیکن نسبتاً کم رومانوی اوقات میں ہم جانتے ہیں کہ یہ اصل معاملات سے فرار ہے، کہ یہ بربریت کی صنم پرستی ہے، جیسے ہماری نوجوانی کی متعدد آرا محض شباب کی بے آہنگیوں کا بے قرار اظہار ہی ہوتی ہیں، انفرادی بلوغت کے معاصر تساہل میں سے متعلقہ دکھ کا ایک جزو۔ بچے کھچے وحشی قبائل کا مطالعہ ان کے ہاں بچوں کی بلند شرحِ اموات، مختصر عمر، کمتر رفتار، ان کے کمتر سٹیمنا، ان کے کمتر عزم اور ان کی برتر وباؤں سے روشناس کرواتا ہے۔ ان کی دوستانہ اور رواں وحشت فطرت جیسی ہے— مسرت انگیز، مگر صرف حشرات اور خاک کے لیے۔

تاہم، کوئی وحشی جوابی دلیل دیتے ہوئے سوال کر سکتا ہے کہ ہم اپنی سیاست اور اپنی جنگوں سے کیسے حظ اٹھاتے ہیں، اور آیا اپنے خیال میں ہم ان قبائل کی نسبت زیادہ خوش ہیں جن کے انوکھے نام علم البشر کی نصابی کتب میں گونجتے ہیں۔ ترقی پر ایمان رکھنے والے شخص کو ماننا پڑے گا کہ ہم نے فنِ حرب میں بہت سی ترقیاں کی ہیں، اور یہ کہ ہمارے سیاست دان (حیرت انگیز استثناؤں کے ساتھ) مائیلو اور کلوڈییس کے زمانوں میں رومن فورم کی زینت ہوتے۔ جہاں تک مسرت کا معاملہ ہے تو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا؛ یہ ایک چھلیا فرشتہ ہے، سراغ لگائے جانے پر تباہ شدہ اور شاذونادر ہی قابل پیمائش۔ غالباً اس کا اولین دارومدار صحت پر، اس کے بعد محبت اور سوم دولت پر ہے۔ جہاں تک دولت کا معاملہ ہے تو ہم نے ایسی ترقی پائی کہ یہ ہمارے دانشوروں کے ضمیر پہ چھائی ہوئی ہے؛ محبت کے معاملے میں ہم لاثانی اختراع پسندی اور تنوع کے ذریعے اپنی کمی کا ازالہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ متوازن غذا کے عارضی پیمانے اور ادویات اس یقین پر مائل کرتے ہیں کہ ہم سابقہ سادہ زمانوں کے سادہ انسانوں کی نسبت بیماریوں کا زیادہ شکار ہوں گے، لیکن یہ ایک فریب نظر ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جہاں ڈاکٹر زیادہ ہوں وہاں بیماری بھی پہلے کی نسبت زیادہ ہوگی۔ لیکن حقیقت میں ہم اتنے امراض کا شکار نہیں جتنا کہ پہلے ہوا کرتے تھے؛ ہماری

دولت ہمیں بیماری کا علاج کرنے اور اس پر فتح پانے کے قابل بناتی ہے جبکہ قدیم لوگ بیماریوں کے یونانی نام تک جانے بغیر ان کا شکار ہو جایا کرتے تھے۔

تاریخ کا خاکہ

یہ اعترافات اور ترمیمات کرنے کے بعد آیئے ترقی کے مسئلے کا پورے تناظر میں جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاریخ پہ نظر ڈالنے پر ہم ابھرتی اور انحطاط کا شکار ہوتی ریاستوں کا ایک گراف دیکھتے ہیں۔۔۔ کسی مہیب فلم پر محو ہوتی ہوئی اقوام اور ثقافتیں۔ لیکن ممالک کی اس بے ترتیب حرکت اور انسانوں کے انتشار میں، مخصوص عظیم لمحات چوٹیوں اور انسانی تاریخ کے جوہر کے طور پر سرفراز ہیں۔۔۔ ایسی عظیم ترقیاں جو ایک مرتبہ حاصل ہو جانے کے بعد کبھی ضائع نہ ہوئیں۔ انسان وحشی سے سائنس دان کی جانب قدم بہ قدم آگے بڑھا، اور یہ قدم اس کی نشو و نما کے مراحل ہیں۔

1- گفتار ...... اسے ایک اچانک کامیابی خیال نہ کریں، اور نہ ہی دیوتاؤں کی جانب سے ایک تحفہ سمجھیں، بلکہ یہ بول کر اظہار کرنے کی ایک سست رو ترقی ہے۔ اس میں صدیوں کی کاوش ملوث ہے، جانوروں کی جفتی کے لیے پکار سے لے کر شاعری کے نغماتی سُروں تک۔ الفاظ سے عام اسما کے بغیر، جو مخصوص امیجز کو کسی طبقے کی نمائندگی کی قابلیت عطا کر سکتے ہوں گے، تعمیم اپنے آغاز میں ہی مفقود ہو جاتی، اور استدلال وہیں کا وہیں رہ جاتا جہاں ہم اسے وحشی کے ہاں پاتے ہیں۔ الفاظ کے بغیر فلسفہ اور شاعری، تاریخ اور شاعری ناممکن ہوتے، اور فکر شاید کبھی بھی آئن سٹائن یا اناطولی فرانس کی لطافت والی سطح کو نہ پہنچ سکتی۔ الفاظ کے بغیر مرد مرد نہ بن سکتا۔۔۔ یا عورت عورت نہ بن پاتی۔

2- آگ ...... آگ نے آب و ہوا پر انسان کا انحصار ختم کیا، اسے کرۂ ارض پر زیادہ دور تک پھیلایا، اس کے اوزاروں کو پان دے کر زیادہ سخت اور پائیدار بنایا، اور ہزاروں ایسی اشیا کھانے

پینے کے قابل بنایا جو قبل ازیں نا قابل خوردنی تھیں۔ نیز، آگ نے انسان کو رات پر فتح دلائی اور شام وسحر کے اوقات میں جان ڈال دی۔ ذرا غیر مفتوح تاریکی کا تصور کریں؛ حتیٰ کہ آج بھی اُس قدیم پاتال کی خوفناکیاں ہماری روایات اور شاید ہمارے خون میں زندہ ہیں ـــ کسی دور میں ہر اماوس ایک المیہ تھی اور انسان غروبِ آفتاب کے وقت خوف کے مارے کانپتے ہوئے اپنے غار میں گھس جاتا۔ آج ہم طلوع آفتاب تک اپنے غاروں میں نہیں گھستے، اور اگرچہ ابھرتے سورج کا نظارہ نہ کرنا بے وقوفی ہے، لیکن اپنے قدیم خوفوں سے نجات پانا کتنا بہتر ہے! انسان کے بنائے ہوئے اربوں ستاروں کے ساتھ رات کا یہ پھیلاؤ روحِ انسانی کو معمور کیے ہوئے ہے، اور اس نے جدید زندگی میں ایک جاندار تفریح پیدا کر دی ہے۔ ہم روشنی کا شکر کبھی ادا نہیں کر پائیں گے۔

3-جانوروں پر فتح ...... ہماری یادیں اتنی جلد محو ہو جانے والی ہیں اور ہمارا تخیل اتنا زیادہ غیر تخیلاتی ہے کہ ہم انسان سے بڑے درندوں سے حاصل کردہ تحفظ کی رحمت کو محسوس نہیں کر پاتے۔ اب جانور ہمارے کھلونے اور لاچار خوراک ہیں، لیکن ایک دور ایسا بھی تھا جب انسان شکار کرنے کے ساتھ ساتھ خود شکار بھی ہوتا تھا، جب غار یا جھونپڑے سے باہر ہر قدم ایک ایڈونچر تھا اور زمین پر بسنا بدستور خطرناک تھا۔ سیارے کو انسانی بنانے کے لیے یہ جنگ یقیناً انسانی تاریخ کی اہم ترین جنگ تھی؛ اس کے سامنے تمام جنگیں کچھ بھی نہیں، ماسوائے خاندانی جھگڑوں کے۔ جسمانی طاقت اور ذہن کی قوت کے درمیان یہ جدوجہد طویل اور ریکارڈ سے پہلے کی صدیوں میں ہوئی؛ اور آخرکار جب اس میں فتح حاصل کر لی گئی تو انسان کی نصرت کا پھل ـــ زمین پر اس کا تحفظ ـــ ہزاروں نسلوں تک پہنچا اور ماضی سے آنے والے سینکڑوں تحائف پیدائش کے وقت ہمارے ورثے کا حصہ بنے۔ اس قسم کے تصادم اور اس قسم کی فتح کے سامنے ہماری عارضی پسپائیاں کیا وقعت رکھتی ہیں؟

4-زراعت...... شکار کے مرحلے میں تہذیب ناممکن تھی؛ یہ ایک مستقل مسکن، ایک آباد

انداز حیات کی متقاضی تھی۔ یہ گھر اور سکول کے ساتھ آئی، اور ایسا کرنا اس وقت تک ممکن نہ ہو سکا جب تک کھیت کی پیداواروں نے جنگل کے جانوروں یا ریوڑوں (بطور خوراک) کی جگہ نہ لے لی۔ اپنے شکار تک پہنچنے کے لیے شکاری کی مشکلات میں اضافہ ہوتا گیا، جبکہ گھر پر موجود عورت نے ثمر آور کھیت کو سینچا۔ عورت کی جانب سے اس متحمل زراعت کاری نے مرد کے چنگل سے نکلنے کا خطرہ پیدا کر دیا، اور مرد نے اپنی حاکمیت جتانے کی خاطر آخر کار کھیتی باڑی کی راہ اپنائی۔ انسانی تاریخ کے اس عظیم ترین عبور میں بلاشبہ ہزاروں سال لگ گئے، لیکن اس کی تکمیل ہونے پر تہذیب کی ابتدا ہوئی۔ Meredith نے کہا کہ عورت آخری مخلوق ہوگی جسے مرد سدھائے گا۔ اس کا کہنا غلط تھا۔ تہذیب مرکزی طور پر دو چیزوں کی دین ہے: گھر، جس نے وہ سماجی مزاج وضع کیے جو معاشرے کا نفسیاتی سیمنٹ بنتے ہیں، اور زراعت جس نے مرد کو شکاری، گلہ بان اور قاتل کی سیلانی زندگی سے سرفراز کر کے ایک ہی جگہ پر اتنے لمبے عرصے کے لیے آباد کر دیا کہ وہ مکانات، سکول، عبادت خانے، کالج، یونیورسٹیاں، تہذیب تعمیر کرنے کے قابل ہوا۔ لیکن یہ عورت ہی تھی جس نے مرد کو زراعت اور گھر دیا؛ اس نے مرد کو اسی طرح سدھایا جیسے بھیڑ اور سور کو سدھایا تھا۔ مرد عورت کا آخری گھریلو جانور ہے، اور شاید وہ سب سے آخر میں عورت کے ہاتھوں مہذب بنے گا۔ ابھی کام کا آغاز ہی ہوا ہے: میںیوز پر ایک نظر ڈال لینے سے ہی پتا چل جاتا ہے کہ ہم ابھی تک شکار کے مرحلے میں ہیں۔

5۔سماجی تنظیم......دو آدمیوں کی آپس میں لڑائی ہو رہی ہے: ایک دوسرے کو چت کرتا، مار ڈالتا اور پھر نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ زندہ رہنے والا شخص ہی درست ہونا چاہیے، اور ہلاک ہو جانے والا لازماً غلط ہوگا — بین الاقوامی تنازعات میں اس قسم کا مظاہرہ اب بھی قابل قبول ہے۔ اُدھر دو مزید آدمیوں کا جھگڑا ہو رہا ہے: ایک دوسرے سے کہتا ہے، ''چلو لڑنا بند کرتے ہیں — کہیں ہم دونوں ہی نہ مارے جائیں؛ آؤ اپنے اختلافات قبیلے کے کسی بزرگ کے پاس لے کر جائیں اور اسی کا فیصلہ قبول کریں۔'' یہ انسانی تاریخ میں ایک اہم مرحلہ تھا! کیونکہ اگر جواب ''نہیں''

میں ہوتا تو بربریت جاری رہتی؛ اگر یہ ''ہاں'' میں تھا تو تہذیب نے انسان کے حافظے میں ایک اور جڑ بودی تھی: بے ترتیبی کی نظم، بہیمیت کی انصاف، تشدد کی قانون کے ساتھ تبدیلی۔ یہاں بھی ایک تحفہ غیر محسوس طور پر موجود ہے، کیونکہ ہم اس کی حفاظت کے مسحور کن حلقے کے اندر پیدا ہوئے ہیں، اور تب تک اس کی قدر و قیمت سے آشنا نہیں ہوتے جب تک کرۂ ارض کے بے ہنگم یا دور افتادہ خطوں میں نہ نکل جائیں۔ خدا جانتا ہے کہ ہماری کانگریسیں اور ہماری پارلیمنٹس نہایت مشکوک قسم کی اختراعات ہیں، لیکن اس کے باوجود ہم جان و مال کا کچھ تحفظ کر ہی لیتے ہیں۔ سول جنگ یا انقلاب کی وجہ سے قدیمی حالات میں واپس پہنچنے پر یہ تحفظ زیادہ قابل قدر معلوم ہوتا ہے۔ آج کے محفوظ سفر کا موازنہ قرون وسطیٰ کی لٹیروں سے بھری ہوئی شاہراہوں کے ساتھ کریں۔ تاریخ میں اس سے پہلے کبھی بھی ایسی ترتیب اور آزادی موجود نہ تھی جو آج انگلینڈ میں ملتی ہے، اور کسی روز امریکہ میں بھی ہوگی، جب میونسپل آفس قابل اور معزز لوگوں کے لیے کھولنے کی راہ تلاش کر لی جائے گی۔ تاہم، ہمیں کسی بدعنوانی یا جمہوری بدانتظامی کے متعلق زیادہ پرجوش نہیں ہونا چاہیے: سیاست زندگی نہیں، بلکہ محض زندگی کے پودے پر لگایا گیا ایک پیوند ہے؛ اس بیہودہ میلوڈراما میں معاشرے کا روایتی نظم استوار ہے، خاندان اور سکول میں، ہزاروں ڈھکے چھپے اثرات میں جو ہماری دیسی لاقانونیت کو کچھ حد تک تعاون اور نیک نامی ودیعت کرتے ہیں۔ اس کا شعور رکھے بغیر ہم سماجی نظم کی پرتعیش میراث سے فیض یاب ہوتے ہیں جو سینکڑوں نسلوں نے آزمائش اور خطا کے ذریعے ہمارے لیے تخلیق کیا۔ ہم جمع شدہ علم اور منقول دولت سے بہرہ مند ہیں۔

6-اخلاقیات......اب ہم مسئلے کے قلب تک پہنچتے ہیں۔ کیا انسان اخلاقی لحاظ سے پہلے کی نسبت بہتر ہو گئے ہیں؟ جہاں تک ہمارے اخلاقی اصولوں میں عقلی عنصر کا تعلق ہے تو ہم نے بہتری دکھائی ہے: ذہانت کی اوسط میں اضافہ ہوا ہے، اور ''ترقی یافتہ'' اذہان کی تعداد میں بھی خاصا اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ البتہ کردار کے معاملے میں شاید ہم پیچھے ہٹے ہیں: فکر کی لطافت میں اضافہ روح کے استحکام کی قیمت پر ہوا؛ ہم دانشور اپنے باپوں کی موجودگی میں بے سکونی سے محسوس

کرتے ہیں کہ اگرچہ ہم اپنے دماغ میں بھرے ہوئے نظریات کی تعداد میں ان پر سبقت لے گئے ہیں اور اگرچہ ہم نے خود کو مسرت انگیز توہمات سے نجات دلا دی ہے، مگر ہم صبر و تحمل، اپنے مقاصد سے والہانہ لگاؤ اور شخصیت کی سادہ طاقت میں ان کی نسبت کمتر ہیں۔

لیکن اگر اخلاقیات سے مراد مسیح کے ضابطۂ اخلاق میں سراہی گئی خوبیاں ہیں تو ہم نے اپنی بارودی سرنگوں اور کچی آبادیوں، اپنی جمہوری بدعنوانی اور شہری شہوت رانی کے باوجود کچھ عارضی ترقی کی ہے۔ ہم پہلے کی نسبت تھوڑا بہت شفیق نوع بن گئے ہیں: ہم اور بھی زیادہ مہربانی کرنے کی استعداد رکھتے ہیں اور حتیٰ کہ اجنبی یا کچھ عرصہ پہلے تک دشمن لوگوں کے ساتھ فراخ دلی سے پیش آ سکتے ہیں۔ نجی خیرات اور انسانی فلاح کے کاموں میں امریکہ کی حصہ داری صرف ایک سال (1928ء) میں ہی دو ارب ڈالر سے زائد تھی۔۔ اس سال امریکہ میں زیر گردش کل رقم کا نصف۔ آج بھی اگر ہم قاتلوں کو پکڑ کر انہیں عدالت میں لا سکیں تو انہیں ہلاک کرتے ہیں، لیکن ''جان کے بدلے جان'' کے قدیم اصول پر کچھ چیں بہ جبیں ہوتے ہیں، اور حتمی طور پر قابل تعزیر جرائم کی تعداد میں تیزی سے کمی واقع ہوئی ہے۔ دو سو سال قبل Merrie انگلینڈ میں ایک شلنگ چرانے پر بھی انسانوں کو قانون کے تحت پھانسی دی جا سکتی تھی، اور آج بھی لوگوں کو زیادہ چوری نہ کرنے پر سخت سزا دی جاتی ہے۔ سکاٹ لینڈ میں چند سو سال قبل ہی کانکن موروثی غلام تھے، فرانس میں مجرموں کو سرعام اور قانونی طور پر اذیت دی جاتی تھی، انگلینڈ میں مقروضوں کو تاحیات قید کی سزا سنائی جاتی تھی اور ''باعزت لوگ'' غلاموں کی خاطر افریقی ساحل پر چھاپے مارا کرتے تھے۔ ایک سو سال سے بھی کم عرصہ پہلے ہماری جیلیں جائے غلاظت و عبرت تھیں جہاں چھوٹے موٹے جرائم کی وجہ سے جانے والے مجرم بڑے جرائم کی تربیت پا کر نکلتے تھے؛ اب ہماری جیلیں تھکن زدہ قاتلوں کے لیے جائے راحت ہیں۔ ہم اب بھی محنت کش طبقات کا استحصال کرتے ہیں، لیکن ''فلاحی'' کام کے ذریعے اپنے ضمیر کی خلش بھی دور کرتے رہتے ہیں۔ Eugenics مصنوعی انتخاب کی مدد سے انسانی مہربانی اور فیاضی کا توازن کمزور کے بے رحمانہ قلع قمع کے ساتھ کرنے کی جدوجہد کرتا رہتا ہے۔

ہمارے خیال میں آج دنیا میں پہلے کی نسبت زیادہ تشدد موجود ہے، لیکن اصل میں صرف اخبارات کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے؛ وسیع اور طاقت ور ادارے جرائم اور سکینڈلز پیش کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ قاری سٹینوگرافی اور یک زوجی پر قانع رہیں؛ اور پانچوں براعظموں کی تمام تر بدمعاشی اور سیاست ایک ہی صفحے پر جمع کر دی جاتی ہے تا کہ ہم اپنا ناشتہ جلدی ختم کر سکیں۔ ہم نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ نصف دنیا باقی نصف دنیا کو مار رہی ہے، اور یہ کہ بقیہ آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ خودکشی پر مجبور ہے۔ لیکن گلیوں بازاروں، گھروں، عوامی اجتماعات، ہزاروں ذرائع آمد و رفت میں کوئی قاتل اور خودکش شخص نہ پا کر ہمیں حیرت ہوتی ہے، بلکہ ہم ایک واشگاف جمہوری خوش اخلاقی اور ایک بے تصنع شرافت دیکھتے ہیں جو ماضی (جب شرفا اپنی عورتوں کو غلام بنا کر رکھتے اور ارض مقدس میں مسیح کے نام پر جنگ کے لیے جاتے وقت بیویوں کی وفاداری زنجیروں کی مدد سے یقینی بنایا کرتے تھے) کی نسبت سینکڑوں گنا زیادہ حقیقی ہے۔

ہمارا شادی کرنے کا موجودہ طریقہ (چاہے کتنا ہی بے ترتیب اور جاذب) اغوا یا خرید کے ذریعے شادی کی نہایت بہتر شکل پیش کرتا ہے۔ مردوں اور خواتین، والدین اور بچوں، اساتذہ اور شاگردوں کے درمیان ظلم و تشدد ماضی کے مقابلے میں بہت گھٹ گیا ہے۔ عورت کی آزادی اور مرد پر سرفرازی بھی سابقہ قاتلانہ نر میں ایک لاثانی نرم روی کی نشان دہی کرتی ہے۔ محبت قدیم انسانوں کو نا معلوم تھی یا وہ اسے محض جسم کی بھوک سمجھتے تھے، لیکن اب یہ نغمہ و جذبات کا خوش نما باغ بن گئی ہے جس میں نوکرانی کے لیے مرد کا جذبۂ شوق لوبان کی طرح ابھر کر زندہ و جاوید شاعری کی اقلیم میں آتا ہے۔ اور جوان لوگ، جن کے گناہ تھکے ہارے بوڑھوں کو بہت پریشان کرتے ہیں، اس کی چھوٹی چھوٹی برائیوں کی تلافی ایسے دانشورانہ اشتیاق اور اخلاقی جرات کے ساتھ کرتے ہیں کہ جو اُس زمانے میں بے وقعت ہوتی جب تعلیم کا محور و مرکز سامنے آنا اور ہماری عوامی زندگی کی تطہیر کرنا تھا۔

7-اوزار ...... رومانویوں، مشین کے دشمن دانشوروں، قدیم دور (گرد، محنت، سانپوں، کیڑے مکوڑوں) کی جانب واپسی کے حامیوں کے سامنے کھڑے ہو کر ہم اوزاروں، انجنوں، مشینوں کا گیت گاتے ہیں جنھوں نے انسان کو پابند سلاسل کیا اور اب آزاد کر رہے ہیں۔ ہمیں اپنی خوش حالی پر شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ اچھی بات ہے کہ کسی دور میں صرف نوابوں اور راجوں تک محدود راحتیں اور مواقع اب سب کو دستیاب ہیں؛ ایک وسیع و عریض ثقافت کے معرض شہود میں آسکنے سے پہلے آسائش کو عام کرنا ضروری تھا— چاہے شروع میں اس کا غلط استعمال ہی ہوا۔ روز افزوں ترقی کرتی ہوئی یہ ایجادات نئے آلات ہیں جن کی مدد سے ہم اپنے ماحول کو کنٹرول کرتے ہیں: ہمیں ان کو اپنے جسموں پر اگانے کی ضرورت نہیں، جیسا کہ جانوروں کو ہوتی ہے؛ ہم انہیں بناتے، استعمال کرتے اور دوبارہ ضرورت پڑنے تک کہیں رکھ چھوڑتے ہیں۔ اب ہم دیوقامت بازو بناتے ہیں جو دس لاکھ آدمیوں کے تعمیر کردہ ہرم کو ایک ماہ میں تیار کر سکتے ہیں؛ ہم اپنے لیے عظیم آنکھیں بناتے ہیں جو آسمان پر نظر نہ آنے والے ستاروں کو تلاش کرتی ہیں، اور ننھی ننھی آنکھیں جو حیات کے خلیوں کو دیکھتی ہیں؛ اگر ہم چاہیں تو اتنی ہلکی آوازوں میں بول سکتے ہیں کہ جو براعظموں اور سمندروں کے پار پہنچ جائیں؛ ہم لازماں دیوتاؤں جیسی آزادی کے ساتھ خشکی اور تری پر سفر کرتے ہیں۔ مانا کہ محض رفتار بے وقعت ہے: انسانی ہمت اور استقامت کی علامت کے طور پر ہوائی جہاز ہمارے لیے اعلیٰ ترین مفہوم رکھتا ہے: پرومیتھیئس کی طرح عرصہ دراز سے زمین کے ساتھ بندھے ہوئے انسانوں نے انجام کار خود کو آزاد کر لیا اور اب ہم شاہین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکتے ہیں۔

نہیں، یہ اوزار ہم پر فتح حاصل نہیں کر پائیں گے۔ مشینری کے ہاتھوں ہماری موجودہ شکست ایک عارضی چیز ہے، غلاموں سے پاک دنیا کی طرف ہماری واضح ترقی میں ایک عارضی قیام۔ آقا اور انسان دونوں کی تذلیل کرنے والی جسمانی محنت کا بوجھ انسانی کاندھوں سے اتر گیا ہے اور لوہے و فولاد کے بے تکان پٹھوں کو کام میں لایا جا رہا ہے؛ جلد ہی ہر آبشار اور ہر ہوا اپنی مفید توانائی فیکٹریوں اور گھروں میں انڈیلے گی اور انسان ذہنی کاموں سے آزاد ہو جائے گا۔ غلام کو انقلاب

کے بجائے ایجاد آزادی دلائے گی۔

8-سائنس ......بکل کا کہنا کافی حد تک درست تھا: ہم صرف علم میں ترقی کرتے ہیں، اور یہ دیگر تحائف ذہن کی سست روتنویر میں جڑیں رکھتے ہیں۔ یہاں تحقیق کی بے عنوان شان وشوکت اور لیبارٹری کی خاموش جنگوں میں ایک کہانی موجود ہے جو سیاست کی فریب دہی اور جنگ کی بربریت کی ہم پلہ ہے۔ یہاں انسان اپنے بہترین جوہر رکھتا ہے، اور ظلمت وتادیب سے گزر کر مستقل رفتار پر روشنی کی جانب اوپر اٹھتا ہے۔ اسے ایک چھوٹے سے سیارے پر کھڑے ہوئے دیکھیں، وہ آنکھ سے نظر نہ آنے والے مجمع الکواکب کو ناپتا، تولتا اور پرکھتا ہے۔ کرۂ ارض، سورج اور چاند کے اتار چڑھاؤ کی پیش گوئیاں کرتا ہے؛ اور دنیا کی پیدائش وموت کا شاہد ہے۔ یا کوئی بظاہر بے عمل ریاضی دان جانکاہ محنت کے ذریعے نئے فارمولوں کو آزماتا ہے، ایجادات کے ایک غیر مختتم سلسلے کے لیے راہ ہموار کرتا ہے جن کی بدولت اس کی نسل کی طاقت میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا۔ یہاں ایک پل موجود ہے: دو ساحلوں پر چار فولادی رسوں کے سہارے معلق لاکھوں ٹن لوہا، لاتعداد انسانوں کی گزرگاہ؛ یہ شیکسپیئر کی کسی بھی نظم جتنا ہی شاعرانہ ہے۔ یا اِس شہر نما عمارت پر غور کریں جو جرات مندانہ انداز میں آسمان پر ابھری ہوئی ہے اور رات کے وقت ہیرے جڑے گرینائٹ کی طرح دمکتی ہے۔ یہاں فزکس میں نئی جہات، نئے عناصر، نئے ایٹم اور نئی قوتیں موجود ہیں۔ یہاں چٹانوں میں زندگی کی سوانح لکھی ہے۔ لیبارٹریوں میں حیاتیات نامیاتی دنیا کو اسی طرح منقلب کرنے کی تیاری کر رہی ہے جیسے فزکس نے مادے کو تبدیل کیا۔ ہر طرف آپ کا واسطہ تحقیق کرتے ہوئے سچے اور بے انعام افراد سے پڑتا ہے؛ آپ کو مشکل سے ہی سمجھ آتی ہے کہ ان کی لگن کہاں سے صادر ہوتی اور نشوونما پاتی ہے۔ لیکن وہ کام جاری رکھتے ہیں۔

ہاں، یہ درست ہے کہ مادے پر انسان کی یہ فتح انسان کی خود پر حاصل کی کوئی کسی فتح کا جوڑ نہیں۔ ترقی کے حق میں دلیل ایک مرتبہ پھر لڑکھڑا جاتی ہے۔ نفسیات نے انسانی رویے اور خواہش کی تفہیم کا بمشکل آغاز ہی کیا ہے، اور اسے کنٹرول کرنا تو ابھی بہت دور کی بات ہے؛ یہ روحانیت

اور مابعد الطبیعات، تحلیلی نفسیات، کرداریت، گلینڈز کی اسطوریات اور عنفوان شباب کے دیگر امراض کے ساتھ مدغم ہے (باریک بیں اور ترمیم شدہ بیانات صرف وہ ماہرین نفسیات دیتے ہیں جن کی بات کوئی نہیں سنتا؛ امریکہ میں قطعی بیانات کے لیے عوامی ذوق وشوق ہر سائنس کو عارضی رواج میں بدل دیتا ہے)۔ لیکن نفسیات ان بیماریوں اور طوفانوں کے ہتھے چڑھنے سے بچ جائے گی؛ یہ اپنی لی ہوئی ذمہ داریوں کے ذریعے دیگر پرانی سائنسوں کی طرح بلوغت پائے گی۔ اگر ایک اور بیکن نے آکراس کی اقلیم کو ناپا، اس کے موزوں طریقہ ہائے کار اور مقاصد کی توضیح کی اور تسخیر کے قابل ''ثمرات اور اختیارات'' کی نشاندہی کی تو ہم میں سے کون لوگ— تاریخ کی حیرتوں اور انسان کی ہٹ دھرمی کو جانتے ہوئے— ایسے ہیں جو ذہن کے بڑھتے ہوئے علم کی ممکنہ کامیابیوں کی حدود متعین کریں گے؟ ہمارے اپنے عہد میں ہی انسان اپنے نئے سرے سے بنائے ہوئے ماحول سے منہ موڑنے اور خود کو پھر سے ڈھالنے کا آغاز کر چکا ہے۔

9-تعلیم......ہم ماضی کے جمع شدہ تجربے کو اگلی نسل تک زیادہ سے زیادہ مکمل طور پر منتقل کرتے ہیں۔ یہ کافی حد تک ایک معاصر اختراع ہے، سکولوں کے ساز و سامان اور سب کو تعلیم دینے پر لگنے والی دولت اور محنت کا زبردست خرچہ؛ شاید یہ ہمارے عہد کی نمایاں ترین خوبیوں میں سے ایک ہے۔ کسی دور میں ہمارے کالج پر تعیش تھے جنہیں امیر طبقے کے مردوں کے لیے ڈیزائن کیا گیا۔ آج یونیورسٹیوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ ان سے بھاگنے والا بھی پی ایچ ڈی کر سکتا ہے۔ ہم نے قدیم دور کے منتخب جینیئسوں پر سبقت حاصل نہیں کی، لیکن انسانی علم کی سطح اور اوسط کو تاریخ کے کسی بھی دور کی نسبت کہیں زیادہ بلند کر دیا ہے۔ افلاطون اور ارسطو کے بجائے احمق، متعصب اور ظالم ایتھنی اسمبلی کے بارے میں سوچیں، ووٹ دینے کے حق اور آرفک رسوم کی ادائیگی سے محروم اور غلام عورتوں کو ذہن میں لائیں جو صرف طوائفیں بن کر ہی تعلیم حاصل کر سکتی تھیں۔

صرف بچہ ہی شکایت کرے گا کہ ان پھلتے پھولتے ہوئے سکولوں، ان بھری ہوئی مخلوط یونیورسٹیوں نے ابھی تک دنیا کو نئے سرے سے نہیں بنایا۔ تاریخی تناظر میں تعلیم کا عظیم تجربہ ابھی

شروع ہی ہوا ہے۔ ابھی تک اسے اپنا آپ ثابت کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ یہ دس ہزار سال کی لاعلمی اور توہم کا اثر صرف ایک پشت میں زائل نہیں کر سکتا، صرف جہالت کی بلند شرح پیدائش اور رائے شماری کے ذریعے راسخ العقیدگی کی کثریت ہی انجام کار تعلیم پر فتح پا سکتے ہیں۔ ترقی کی جانب یہ قدم ایسا نہیں جس کے متعلق ہم فی الحال کہہ سکیں کہ یہ نوع انسان کی ایک مستقل کامیابی ہے۔ لیکن مفید نتائج سامنے آ چکے ہیں۔ ذہن کی بردباری اور آزادی جنوب کی نسبت شمال کی ریاستوں میں زیادہ آسانی سے کیوں پھلتی پھولتی ہے؟ اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ ابھی تک جنوب نے اتنی دولت نہیں کمائی کہ کافی مقدار میں سکول تعمیر کر سکے؟ کون جانے کہ دفتر میں اوسط صلاحیت اور راہنمائی میں تنگ ذہنی کے لیے ہماری ترجیح کس حد تک ایک ایسی نسل کا نتیجہ ہے جو معاشی و سیاسی استحصال کا شکار خطوں سے تعلق رکھنے والے علاقوں سے آئی اور ذہن میں ہل چلانے اور بیج بونے کی فراغت نہیں رکھتی؟ اگر ہم میں سے ہر شخص نے بیس سال تک سکول میں پڑھ لیا اور انسانی نسل کے عقلی خزائن تک مساوی رسائی پا لی تو تعلیم کے بھرپور ثمرات کیا ہوں گے؟ ایک بار پھر والدینی محبت کی جبلت پر غور کریں: یہاں انسانی ترقی کی حیاتیاتی برتری ملتی ہے، کسی بھی قانون سازی یا کسی اخلاقی ناصحانہ پن کی نسبت زیادہ معتبر قوت، لیکن اس کی جڑیں عین انسانی فطرت میں ہیں۔ عنفوان شباب طول پکڑ لیتا ہے: ہم زیادہ لاچاری کے ساتھ آغاز کرتے ہیں، اور اب ہم اُس بلند تر انسان کی جانب زیادہ نشو و نما پاتے ہیں جو ہماری تاریکی زدہ روحوں سے بچ نکلنے کی جدوجہد کرتا ہے۔ ہم تہذیب کا خام مال ہیں۔

ہم تعلیم کو ناپسند کرتے ہیں کیونکہ جوانی میں یہ ہمیں اصل صورت میں نہیں پیش کی جاتی تھی۔ اسے حقائق اور تاریخوں کا ایک دردناک مجموعہ نہ سمجھیں بلکہ عظیم لوگوں سے باعثِ تجلیل قرابت کا ذریعہ خیال کریں۔ اسے ''روزی کمانے'' کی تیاری کے بجائے اپنی دنیا کی تفہیم، کنٹرول اور قدر افزائی کے لیے ہر ممکنہ استعداد کو ترقی دینے کے طور پر لیں۔ سب سے بڑھ کر اسے بھرپور تعریف کے مطابق ایک تکنیک خیال کریں جس کے ذریعے ٹیکنالوجیکل، عقلی، اخلاقی اور آرٹسٹک ورثہ (فرد اور انسان بنانے والی ترقی) ہر ممکن کامل انداز میں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک منتقل ہوتا

ہے۔ تعلیم ہی کی وجہ سے ہم انسانوں کی طرح عمل کرتے ہیں۔ ہم پیدائش کے وقت بمشکل ہی انسان ہوتے ہیں؛ ہم انسان بنتے ہیں، انسانیت سینکڑوں راستوں سے ہم پر وارد ہوتی ہے اور ماضی ہمارے حال میں وہ ذہنی اور ثقافتی ورثہ انڈھیلتا ہے جسے محفوظ رکھنا، جمع کرنا اور آگے منتقل کرنا نوع انسانی کو (تمام نقائص اور جہالتوں کے باوجود) کسی بھی سابقہ نسل کی نسبت بلند تر سطح پر قائم رکھے ہوئے ہے۔

10۔ **تحریر اور چھپائی** ......ایک بار پھر ہمارا تخیل اس قدر کم قوت پرواز رکھتا ہے کہ مکمل تناظر پر نہیں پہنچ پاتا؛ ہم علم وادب وجود میں آنے سے پہلے کے جہالت، ناطاقتی اور خوف کے طویل ادوار کو تصور میں نہیں لا سکتے۔ اُن ریکارڈ سے باہر صدیوں میں انسان صرف زبانی الفاظ کے ذریعے ہی اپنی کہانی کو نسل در نسل آگے منتقل کر سکتے تھے؛ اگر ایک پشت بھول جاتی یا غلط مطلب لے لیتی تو علم کی ناتواں سیڑھی پر نئے سرے سے چڑھنا پڑتا۔ تحریر نے ذہن کے کارناموں کو ایک نئی پائیداری عطا کی؛ اس نے فلسفے کے ذریعے تلاش کردہ دانش اور ڈرامہ وشاعری میں تراشی ہوئی خوب صورتی کو غربت اور توہم کے ہزاروں برس میں محفوظ رکھا۔ اس نے نسلوں کو ایک مشترکہ ورثے میں باہم باندھ دیا؛ اس نے مُلکِ ذہن تخلیق کیا جس میں، تحریر کی وجہ سے، جینیئس کو موت آنا ضروری نہ رہا۔

جس طرح تحریر نے نسلوں کو آپس میں باندھا، اسی طرح چھپائی اپنی ہزاروں بدکاریوں کے باوجود تہذیبوں کو باہم باندھ سکتی ہے۔ اب یہ ضروری نہیں کہ ہمارے سیارے کی عمر پوری ہونے سے پہلے تہذیب غائب ہو جائے گی۔ یہ اپنا مسکن تبدیل کر لے گی؛ بلاشبہ ہر ملک میں زمین انجام کار کھیتی باڑی کی ضروریات پوری کرنے سے انکار کر دے گی؛ ناگزیر طور پر نئے خطوں کی کنواری دھرتی ہر نسل کو تحریص دلائے گی۔ لیکن تہذیب کوئی مادی چیز نہیں جو کسی قدیم غلام کی طرح زمین کے ایک ہی مقام سے بندھی ہوئی ہو؛ یہ تکنیکی علم اور ثقافتی تخلیق کا مجموعہ ہے؛ اگر انہیں اقتصادی طاقت کی نئی مسند پر منتقل کیا جا سکے تو تہذیب کو موت نہیں آتی، یہ بس اپنا نیا گھر ڈھونڈ لیتی ہے۔

باب 6

تاریخِ عالم کے 12 اہم ترین موڑ

تاریخ کی بارہ اہم ترین تاریخوں کی فہرست بنانے کا خیال مجھے منیلا میں آیا جب میں امریکہ جانے کے لیے بحرالکاہل میں سفر پر روانہ ہو رہا تھا۔ یہ خیال بہت موزوں وقت پر سوجھا تھا، کیونکہ میں ''The Story of Civilization'' کی پہلی جلد پر کام کرتے ہوئے تاریخوں کے مسئلے سے الجھا ہوا تھا۔

مجھ پر پہلے ہی عیاں ہو چکا تھا کہ متن میں تاریخیں شامل کرنے سے داستان کسی انسائیکلوپیڈیا جیسی درست اور پھیکی ہو جائے گی؛ کہ مردہ اعداد و شمار کو جاندار بیانیے میں بدلنے کے لیے تاریخوں کو داستان کے ہر صفحے پر شامل کرنے کے بجائے کسی اور انداز میں دینا پڑے گا۔ کافی آزمائش اور خطا کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ تمام تاریخوں کو حاشیے اور نوٹس میں محدود کر دیا جائے۔ شاید یہ طریقہ سکولوں اور کالجوں میں تاریخ کی نصابی کتب کی وجہ سے پیدا ہونے

والی تکلیف کو کچھ کم کر دیتا۔

کچھ سال پیشتر مجھے اپنے نواحی علاقے کے کچھ تعلیمی اداروں کی نصابی کتب کا جائزہ لینے کا اتفاق ہوا تھا۔ جغرافیہ، جسے نہایت مسحور کن صورت دی جا سکتی تھی، خاص طور پر ناپسندیدہ تھا؛ محض مردہ معلومات کا ایک انبوہ جن میں سے زیادہ تر کو جنگ نے غلط یا بے وقعت بنا دیا تھا؛ معلومات کا کافی بڑا حصہ کسی ملک کی زندگی کے ظاہری خدوخال تک محدود تھا اور مشرق کے خلاف تعصب اسے مضحکہ خیز بنا رہا تھا۔ لیکن تاریخ کی نصابی کتاب — Bear اور Bagley کی ''History of American People'' — کافی سمجھداری سے لکھی گئی تھی؛ اس میں سیاست کے نشیب و فراز بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تہذیبی ترقی کا خاکہ بھی خوشگوار مہارت سے پیش کیا گیا تھا۔ یہ ایک شاندار کتاب ہے۔

بہت سے ہائی سکولوں میں مَیں نے دیکھا ہے کہ تاریخِ عالم پر بریسٹڈ کی ''Ancient Times'' اور اس کے بعد جدید یورپی تاریخ کے متعلق رابنسن اور بیئرڈ کی کتابیں بہترین ہیں۔ ان میں تاریخوں کا حد سے زیادہ استعمال نہیں کیا گیا، اور اگر ہم اتفاق کر لیں کہ تاریخیں ضرورت سے زیادہ استعمال کی گئیں تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہماری کچھ کتب اس غلطی سے پاک رہیں اور متعدد ہماری جوانی کے زمانے کی نصابی کتب سے کافی بہتر ہیں۔

میں اس بات پر بہ مشکل ہی قناعت کروں گا کہ میرے شاگردوں کو صرف بارہ تاریخیں معلوم ہوں، اور فرض کروں گا کہ نانبائیوں والے اس عدد کا انتخاب زیادہ سے زیادہ کے بجائے کم از کم پر دلالت کرتا ہے — یوں کہہ لیں کہ یہ ایسی تاریخیں ہیں جو ہر نانبائی کو معلوم ہونی چاہئیں۔ یقیناً وظائف اور مقاصد کی مناسبت سے ہی تعین کیا جا سکتا ہے کہ کسی شخص کو کتنی تاریخیں یاد رکھنی چاہئیں۔ کوئی کسان اگلے میلے کے علاوہ کوئی بھی اور تاریخ ذہن میں رکھے بغیر اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دینے اور عمدہ کنبہ پالنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ لیکن عقلی زندگی گزارنے کی بددعا اور تجربے و عمل کے گہرائی عطا کرنے والے روابط سے محروم شخص کو انسان کی سنین وار ترتیب کا کافی علم ہونا چاہیے تاکہ (وسیع ذاتی تجربے کے ایک ناقص متبادل کے طور پر) ایک تاریخی تناظر حاصل

کر سکے جو فلسفے اور تفہیم کی جانب جانے والی راہوں میں سے ایک ہے۔

اس قسم کے آدمی کو یہ بتانے کے قابل ہونا چاہیے کہ کونسی صدیوں (اگر دوٹوک تاریخ بتانا لازمی نہ ہو) میں دنیا کو بدل دینے والی ایجادات ہوئیں، جیسے بارود، چھاپہ خانہ، دخانی انجن، بجلی اور امریکہ کی دریافت۔ اسے دنیا کے عظیم ترین ریاست کاروں کی صدیوں کے متعلق معلوم ہونا چاہیے— حمورابی، موسیٰ، داریوش اول، سولون، پیریکلیز، سکندر، سیزر، چارلس پنجم، لوئس XIV، پیٹر اعظم، فریڈرک اعظم، ہنری ہشتم، ایلزبتھ، دسرائیلی، گلیڈسٹون، بسمارک، Cavour، واشنگٹن، ہیملٹن، جیفرسن اور لنکن؛ دنیا کے عظیم ترین سائنس دان و فلسفی— مثلاً کنفیوشس، سقراط، افلاطون، ارسطو، کاپرنیکس، فرانسس بیکن، آئزک نیوٹن، سپینوزا، وولٹیئر، کانٹ، شوپنہاور اور ڈارون؛ دنیا کے عظیم ترین اولیا— جیسے اخناتون، لاؤ تزو، یسعیاہ، بدھ، مسیح، مارکس آریلیئس، آگسٹائن، اسیزی کا فرانسس، لویولا، لوتھر اور گاندھی۔

دانشورانہ دلچسپی رکھنے والے شخص کو دنیا کے عظیم ترین شعرا کی صدیوں کا علم بھی ہونا چاہیے— مثلاً ہومر، زبوری، یوری پیڈیز، ورجل، ہوریس، لی پو، دانتے، شیکسپیئر، ملٹن، گوئٹھے، پشکن، کیٹس، بائرن، شیلی، ہیوگو، پو، وٹمین اور ٹیگور۔ دنیا کے عظیم ترین نغمہ گر— جیسے پیلسٹرینا، باخ، ہینڈل، موزارٹ، بیتھوون، شوپاں، لسزٹ، پاگنیانی، براہمز، تخیا کوفسکی، وردی، واگنر، پیدروفسکی اور سٹراونسکی؛ اور دنیا کے عظیم ترین فن کار یا فن پارے— مثلاً کارنک اور الاقصور اور اہرام، فیدیاس اور پراکست لیز، ووتاؤ-تزو اور Sesshiu اور ہیروشگی، شاتروس اور تاج محل، جوتو اور ڈیورر، لیونارڈو، رافیل اور مائیکل اینجلو ٹیشین اور کوراجو، ایل گریکو اور ویلازکوئز، روبنز، ریمبراں اور وان ڈائیک، رینالڈز اور گینز برو، ٹرنر اور وِسلر، ملے (Millet) اور چیزانے۔

میں عظیم نثر نگاروں کو چھوڑ گیا، مبادا یہ باب ٹیلی فون کی ڈائریکٹری یا ''گندے مندے غیر ملکیوں'' کے رجسٹر جیسا لگنے لگے۔ یہاں قاری اپنا ایک معبد خانہ بنانے کے ذریعے میری مدد کر سکتا ہے۔ قاری کو چاہیے کہ دوستوں اور خود سے ان صدیوں اور عظیم آدمیوں کے کام کے متعلق پوچھے (شاید ہمیں عظیم عورتوں کی فہرست بھی شامل کرنی چاہیے، ملکہ ایلزبتھ سے لے کر حت شپ ست

اور مادام کیوری تک)، اور ایک نئی فہرست میں درجہ بند کرے۔

تاہم، اگر آپ ذہنی صحرائی جزیرے پر زندگی گزارنے کی لعنت کا شکار ہوں اور صرف اپنے ساتھ بارہ تاریخیں رکھ سکتے ہوں تو غالباً یہ تاریخیں ایسی ہونی چاہئیں کہ نوع انسانی کی اساسی تاریخ کا اشارہ رکھتی ہوں۔ ان کے اردگرد انسانی ذہن کے عظیم تر کارناموں کا حلقہ ہونا چاہیے جو انہیں ترقی کی جانب مہمیز دیں اور ایک ترتیب و تناظر عطا کریں تاکہ پرانا علم واضح ہو جائے اور نیا علم سہولت سے حاصل ہو۔ چونکہ تاریخ متغیر ہے، اور کسی بھی دور میں انسانی سرگرمی کے تمام پہلو بقیہ پہلوؤں کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں، اس لیے کلیدی واقعات کی متعدد ایسی کڑی دار زنجیریں بنائی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ ذیل میں بارہ حتمی عالمی تاریخیں نہیں دی جا رہیں؛ یہ تو محض بارہ تاریخیں ہیں۔

1– 4241 قبل مسیح — مصری کیلنڈر کا آغاز ...... یہ انسانی تاریخ کی قدیم ترین قطعی تاریخ ہے؛ یہ کٹر عقیدہ پرست نفوس کو پریشان کرنے کے لیے کافی ہے جو (بشپ Ussher کی طرح) یقین رکھتے ہیں کہ دنیا کی تخلیق 4004 قبل مسیح میں ہوئی تھی۔ اگر ہم ماہرین مصریات کا یہ کہنا تسلیم کر لیں کہ دنیا کی تخلیق سے 237 سال قبل زیریں نیل میں ایک کیلنڈر موجود تھا تو کسی بھی پاکیزہ ذہن کو شدید دھچکا پہنچے گا۔

کیلنڈر بہت دوررس اثرات کا حامل ہے۔ فلکیات اور ریاضی کی ترقی کو ذہن میں لائیں جو کیلنڈر کی تشکیل سے پہلے موجود رہی ہوگی۔ غور کریں کہ اس وقت بھی ایک تہذیب نے معاشی زندگی میں سے اتنا کچھ کتنے عرصے میں بچایا ہوگا کہ فارغ آدمی ستاروں کے جدول بنانے اور سورج کے راستے کا حساب رکھنے کے قابل ہو سکے۔ ہمارے کیلنڈر کی نسبت مصریوں کا کیلنڈر بہت بامعنی تھا: اس میں سال کو تیس تیس دن کے بارہ مہینوں میں تقسیم کیا گیا اور آخر میں مزید پانچ دن جشن منانے کے لیے رکھے گئے۔ یہ سارے مصر کے حافظے میں موجود ہے، ریکارڈ شدہ تہذیب کے تین ہزار برس کے دوران، منظم حکومت، جان و مال کے تحفظ، جسمانی آسائش،

حسیات کی مسرتوں اور ذہن کی تربیت کے ساتھ۔ یہ نخ آپس کی یادگار ہے جس نے سب سے بڑا ہرم تعمیر کروایا؛ اور توتمس سوم کا جس نے کارنک بنایا؛ اور اخناتون کا جس نے ایک گیت کی خاطر اپنی بادشاہت گروی رکھ دی؛ اور کلیوپیٹرا کا جس نے انٹونی کو تباہی سے دوچار کیا۔

2-543قبل مسیح —بُدہ کی موت ......میرے خیال میں کسی بھی اور نفس نے کبھی اتنا زیادہ اثر نہیں ڈالا۔ بات یہ نہیں کہ آج لاکھوں کروڑوں مرد و خواتین بودھی مذہب کو مانتے ہیں؛ دراصل بدھ مت گوتم بدھ کا پیروکار نہیں، بلکہ قصے کہانیوں اور توہمات کا انبوہ ہے جو بدھ کے نام کی اس سے زیادہ حق دار نہیں جتنا کہ کیلون یا تورکیومیڈا یا ٹینیسی کی غضب ناک مسیحیت یسوع مسیح کے نام کی۔ لیکن بدھ کا مطلب ہے ہندوستان، کیونکہ ہندوستان کی روح سائنس کے بجائے مذہب، عمل کے بجائے مراقبے، توپ خانے پر ریاضی یا بموں پر کیمیا کا اطلاق کرنے کے بجائے اخیافی شفقت میں مضمر ہے۔

بدھ نے کہا کہ زندگی دکھ سے بھرپور ہے؛ کسی کو تکلیف پہنچانے اور کسی (مرد یا عورت) سے کوئی بری بات کرنے سے اجتناب کے ذریعے اسے قابل برداشت بنایا جا سکتا ہے۔ آیئے توقع کرتے ہیں کہ یہ سادہ مذہب ہی آج کے ہندو ذہن کے لامتناہی توہمات کی تہ میں موجود ہے، اور بدھ کی تاریخ کو ایک تہذیب کا نقطۂ آغاز خیال کریں جو ہر قسم کے نشیب و فراز، ہر ناانصافی، ہر غلامی سے آشنا ہوئی، مگر بدھ سے لے کر اشوک، گاندھی اور ٹیگور جیسے جینئس اور اولیا پیدا کیے۔

3-478قبل مسیح —کنفیوشس کی موت ......ہمارے پاس چین کی نمائندگی کی کوئی علامت لازماً ہونی چاہیے— چین، سائز میں اس قدر بڑا کہ یہ خود کو ''آسمان تلے سب کچھ'' کہتا ہے، اور اس قدر پرانا کہ گزشتہ چار ہزار سال سے اپنے بادشاہوں کی کارکردگی کا ریکارڈ رکھے ہوئے ہے۔

مجھے سکول کے چینی طلبا پر رشک ہے جنہیں کنفیوشس کا ہر لفظ از بر کروایا جاتا ہے۔ مجھے اس

کی ہر سطر معنی سے لبریز اور قابل اطلاق معلوم ہوئی، اور کبھی کبھی سوچا کہ اگر یہ مقولے بیس سال تک میرے حافظے میں سرایت کر گئے ہوتے تو میری روح کو کچھ قرار آ جاتا، مجھے سادہ وقار، پراطمینان تفہیم اور کردار کی عمق اور بے پناہ خوش اخلاقی نصیب ہو جاتی جو ہر جگہ کے تعلیم یافتہ چینیوں میں پائی جاتی ہے۔ کبھی کسی آدمی نے اپنا نام لوگوں کے چہرے اور روح پر اس طرح نقش نہیں کیا جیسے کنفیوشس نے چین میں کیا۔ آیئے اسے ایک بار پھر علامت مانتے اور ایک تجویز دیتے ہیں: اس کے پیچھے تانگ سلطنت کے شعرا کے نفیس نغمات ہیں، چینی مصوروں کے باطنی لینڈ سکیپ، چینی کوزہ گروں کے کامل پیالے، چینی فلسفیوں کی ورائے مذہب اور دنیاوی دانش؛ شاید اس کا نام تمام تاریخی تہذیبوں کے عظیم ترین جوہر کا مرقع ہے۔

4-399 قبل مسیح —سقراط کی موت ...... زہر کا پیالہ پینے والا یہ انسان جب دنیا سے گزرا تو قدیم تاریخ کی سب سے زیادہ حیرت انگیز تصویر —پیریکلیز کا عہد— بھی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ لیکن اس مرتبہ میرے ذہن میں فلسفہ نہیں ہے۔ مَیں سقراط کے پیچھے اس کا دوست اور محبوب السی بیادیس اور پیلو پونیشیائی جنگ کی تباہ کن المنا کی دیکھتا ہوں۔ مجھے تعلیم یافتہ طوائف اسپا سیا نظر آتی ہے جس کے قدموں میں بوڑھا بھونڈ پیریکلیز کے ساتھ بیٹھا۔ میں پیریکلیز کو اپنے گرد امیر آدمیوں کو جمع کرتے اور ایتھنی ڈراما کی سرپرستی پر مائل کرتے دیکھتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ یوری پیڈیز ڈایونی سیئس کے تھیٹر میں ڈرامے کا انعام حاصل کرنے کی خاطر سوفوکلیز سے مقابلہ کر رہا ہے۔ سوچوں میں گم اکطینیس پارتھینون کے ستون وضع کرتا دکھائی دیتا ہے، جبکہ فیدیاس بالائی حصے پر دیوتاؤں اور سورماؤں کے پیکر تراش رہا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ نوجوان افلاطون پین ایتھنیائی کھیلوں میں انعام جیت رہا ہے۔ میں تاریخ میں کوئی جائے آرام چاہتا ہوں جو اس بہادرانہ اور رنگا رنگ عہد کے ہزاروں پہلوؤں میں سے چند ایک کی ہی یاد تازہ کر دے، جب پہلی مرتبہ پوری ایک تہذیب نے خود کو توہم سے نجات دلائی اور سائنس، ڈراما، جمہوریت و آزادی تخلیق کی، اور پھر روم و یورپ کو ہمارے عقلی و جمالیاتی ورثے کا نصف منتقل کر دیا۔

5-44قبل مسیح —سیزر کی موت ......ڈینش نقاد جارج برانڈیز (جس نے فرانسیسی Taine کو انگلش ادب سمجھنے میں مدد دی تھی) کی وفات سے چند سال قبل ایک امریکی شاگرد ملنے آیا اور اسے بہت دلگیر موڈ میں پایا۔ ''آپ اداس کیوں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ برانڈیز نے جواب دیا: ''تم نہیں جانتے کہ یہ تاریخ کی ایک عظیم ترین احمقانہ غلطی کی سالگرہ ہے —سیزر کا قتل۔''

بوڑھے نقاد کو اپنے گھر کے آس پاس بھی کئی احمقانہ غلطیاں مل سکتی تھیں، جیسے واٹرلو میں نپولین کی شکست، اور شاید اس نے بروٹس کی sottise [حماقت] کی اہمیت میں کچھ مبالغہ آرائی کی۔ کیونکہ ایک لحاظ سے ہم دراصل سیزر کو نہیں بلکہ اس کی موت کے بعد ہونے والی ترقیوں کو یاد رکھنا چاہتے: آگسٹس جیسے ریاست کار کے ہاتھوں (سیزر کے ابتدائی کام کی بنیاد پر) رومن قانون کی تشکیل نو، Pax Romana کی روم تک توسیع کے تحت علوم وفنون کی افزائش۔ ورجل اور ہوریس کی شاعری، پلائنی اور ٹیسی ٹس کی نثر، ایپک ٹیٹس اور آریلیئس کا فلسفہ، ہیدریان اور انٹونینس کی فیض رساں حکومت، فورم کی تحسین اور تعمیرات و مجسمہ سازی پر سرمایہ کاری، اُن شاہراہوں کی تعمیر اور اُن قوانین کی ضابطہ بندی جو جدید دنیا میں روم کی اساسی میراث بنے۔ جس طرح سقراط کی موت کو ایتھنز کا پیریکلیئن عہد انجام پذیر ہونے کا استعارہ کہا جا سکتا ہے، اسی طرح سیزر کی موت روم کے عہد زریں کا دروازہ تھا۔

6-؟قبل مسیح —یسوع مسیح کی پیدائش ...... یہ تاریخ قاری کو بوکھلا دیتی ہے، کیونکہ کوئی بھی اس سے آگاہ نہیں۔ ہمارے لیے یہ اہم ترین تاریخ ہے کیونکہ یہ مغرب میں تمام تاریخ کی تقسیم کرتی، ہمیں ہمارا عظیم ترین ہیرو اور ماڈل، اسطورہ اور داستان کا ایک مجموعہ مہیا کرتی ہے جو ابالٰہیاتی سے ادبی مرحلے تک آ رہا ہے؛ یہ تاریخ اس مسیحی عہد کا آغاز ہے جو اختتام پذیر لگتا ہے۔ ہمارے بعد سیلابِ عظیم ہے؛ خدا ہی جانتا ہے کہ بیسویں صدی میں مسالک اور عقائد کا کیسا ملغوبہ اس کریم و ظالمانہ الٰہیات کی جگہ لے گا جنہوں نے مسیح کو تکریم دی اور رسوا بھی کیا۔

7-632ء۔پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کا وصال ......ہم مغربی کفار کے کیلنڈر کا سن 632 مسلمانوں کی تقویم کے مطابق 10 ہجری بنتا ہے، یعنی ہجرت سے دس سال بعد۔ 632ء/10ھ میں آنحضرتؐ اس دنیا سے رخصت ہوئے۔آپؐ کے قائم کردہ عقیدے کو صدیوں تک شمالی افریقہ پر قاہرہ سے لے کر مصر تک، جنوبی یورپ پر ترکی سے سپین تک، اور نصف ایشیا پر یروشلم سے لے کر بغداد اور تہران سے دہلی تک غالب رہنا تھا۔حتیٰ کہ عیسائیت بھی اپنے نام پر اتنی زیادہ جنگیں لڑنے یا اتنے زیادہ کفار کو ہلاک کرنے کی شیخی نہیں بگھار سکتی۔

اس بے وقعت استثنیٰ کے ساتھ، یہ ایک رفیع الشان مذہب تھا، سختی سے وحدانیت پرست، بتوں اور راہبوں اور اولیا کی کثرت پرستی کو مسترد کرنے والا؛ نظریہ تقدیر پرستی اور جنگی نظم وضبط کی مدد سے مضبوط کردار تعمیر کرتا ہوا۔اس عقیدے نے قرطبہ، غرناطہ، قاہرہ، بغداد اور دہلی میں عظیم جامعات اور ثقافتیں پیدا کیں، دنیا کو عظیم ترین حکمران دیے—ہندوستان کا اکبر—اور سپین، مصر، قسطنطنیہ، فلسطین اور ہندوستان کو الحمرا سے لے کر تاج محل تک خوب صورت عمارات ودیعت کیں۔ آج وہ اپنی سیاسی قطع وبرید ہو جانے کے باوجود تعداد اور قوت میں ترقی کر رہے ہیں؛ ہندوستان اور چین میں وہ ہر روز اور ہر گھنٹے میں نئے معتقد حاصل کر رہے ہیں۔اس بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ مستقبل ان کا نہیں ہے۔

8-1294ء۔راجر بیکن کی موت ......یہ تاریخ بارود کے پہلی مرتبہ استعمال کی کسی بھی دیگر تاریخ جتنی ہی موزوں ہے، کیونکہ اس برس فوت ہونے والے انگلش راہب کو جزوی طور پر اس ایجاد کا ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہے۔راجر بیکن ہی تھا جس نے پہلی بار قطعی انداز میں اس دھماکہ خیز مواد کو بیان کیا۔بارود نے دنیا میں انقلاب بپا کر دیا اور تمام متقی ریاست کاروں کو ضبط تولید کا ایک متبادل پیش کیا۔اس نے لکھا،''آپ کانسی میں سے اتنا طاقت ور کوندا پیدا کر سکتے ہیں کہ فطرت کا پیدا کردہ کوندا بھی ماند پڑ جائے۔تیار کردہ مادے کی چھوٹی سی مقدار خوفناک دھماکہ اور تیز روشنی پیدا کرتی ہے۔آپ اس مظہر میں اضافہ کر کے پوری فوج یا شہر کو تباہ کر سکتے ہیں۔''

یہ بہت قرین قیاس تھا۔ بارود نے ہی قرونِ وسطیٰ کے اواخر کی ابھرتی ہوئی بورژوازی کو جاگیردار نواب کا تختہ الٹنے کے ذرائع مہیا کر دیے۔ان کے نا قابل فتح رہ چکے قلعوں پر دور سے بمباری کرنے کے ذریعے۔ بارود نے ہی پیدل فوج کو گھوڑ سوار رسالے جتنا غیر موثر بنا دیا اور عام آدمی کو جنگ میں ایک نیا وقار اور انقلابات کو ایک نئی طاقت دی۔ بارود نے ہی جنگ کو شرفا کے ایک کھیل (جو کبھی کبھار مہلک ثابت ہوتا) سے بدل کر بڑے پیمانے پر باضابطہ تباہی بنا دیا۔اس کی بدولت چند منٹ کی بمباری کے ذریعے لاکھوں فنکاروں کی تین سو سال پر محیط محنت کو ملیا میٹ کر دینا ممکن ہو گیا۔شاید یہ انسان کی بہشت بدری کے بعد سب سے اہم تاریخ بنتی ہے؛ البتہ کچھ سنکی لوگ دیگر تاریخیں زیادہ اہم قرار دیں گے: فکر کی ایجاد، عقل کی جبلت سے آزادی، جنس کی تولید سے علیحدگی اور ہر ملک میں نسل کشی کو گنے چنے بدھوؤں پر چھوڑ دینا۔

9-1454ء—جوھانسبرگ کے چھاپہ خانے (مائینتز میں) سے چھپی ہوئی تاریخوں والی اولین دستاویزات کا اجرا ......جرمن لوگ کوئی چودہ سال پہلے سے موو ایبل ٹائپس کی مدد سے پرنٹنگ کرتے آ رہے تھے۔چینیوں نے 1041ء میں بھی اس قسم کی پرنٹنگ کی تھی؛ اور 1900ء میں چین سے ایک بلاک پرنٹ والی کتاب دریافت ہوئی جو 868ء میں شائع کی گئی تھی۔چین میں کچھ بھی نیا نہیں، جمہوریت تو سب سے کم نئی ہے۔انہوں نے بارود ایجاد کیا اور مرکزی طور پر آتش بازی میں استعمال کیا۔انہوں نے چھپائی ایجاد کی مگر اسے کبھی بھی ہفتہ وار اخبارات، جرائم کی کہانیوں یا فرائیڈین سوانحات کے لیے نہیں استعمال کیا۔

مغربی تہذیب میں چھپائی نے متوسط طبقے کو آزادی دلانے اور شہسواروں و پادریوں کی حکومت ختم کرنے میں دولت اور تفنگ کا ساتھ دیا۔اس نے لوگوں کو بائبل پڑھنے کے قابل بنایا اور یوں عہد اصلاح کی راہ ہموار کی۔اس نے مصنف کے نظریات کا حلقۂ اثر نہایت وسیع کر دیا۔ اور کتاب سازی کا فن راہبوں سے پرنٹروں کے شیطانوں کو منتقل کرنے اور کتب کی سرپرستی اشرافیہ و کلیسیا سے عام لوگوں کو منتقل کرنے کے ذریعے جمہوریت و آزاد سوچ کی ترویج و ترقی ممکن ہوئی۔

نپولین نے کہا کہ بوربونز روشنائی پر سرکاری اجارہ قائم رکھنے کے ذریعے انقلاب فرانس کا تدارک کرنے اور خود کو محفوظ رکھنے کے قابل ہو سکتے تھے۔ ہمارے بااختیار متوسط طبقے نے اس مثال سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا اور خواندگی کو حصول صداقت کی راہ میں ایک رکاوٹ بنا دیا ہے۔ آج آپ یہ مشکل ہی جانتے ہیں کہ آیا پرنٹنگ نے فائدہ زیادہ پہنچایا یا نقصان، یا آیا علم کی افزائش نے دماغ میں جتنا کچھ ٹھونسا ہے اس سے زیادہ کردار کو کمزور کیا ہے یا نہیں— لیکن آیئے اسے کچھ مزید آزماتے ہیں۔

10-1492ء— کولمبس کا امریکہ دریافت کرنا ...... جب کولمبس نے امریکہ دریافت کیا تو تجارتی راستوں کو میڈی ٹرینیئن سے اٹلانٹک میں تبدیل کرنے کے ذریعے اطالوی نشاۃ ثانیہ کو اختتام پر پہنچا دیا، اور سپین سے دولت و طاقت لا کر ویلاز کوئز و سروانتیز، میوریلو اور کالدیراں کو ممکن بنایا؛ پھر انگلینڈ میں شیکسپیئر، ملٹن، بیکن اور ہوبز کے لیے فنانسنگ مہیا کی اور نیدرلینڈ میں ریمبراں، سپینوزا، روبنز، وان ڈائیک، ہوبیما اور ریمیر کو جنم دیا؛ اور پھر فرانس میں رابلیس و مانٹینی، پوساں و کلاڈ لورین کے بیج بوئے۔ 1564ء میں جب مائیکل اینجلو فوت ہوا اور شیکسپیئر نے جنم لیا تو یہ نشاۃ ثانیہ کی اٹلی میں موت اور انگلینڈ میں دوبارہ پیدائش کا اشارہ تھا۔ امریکہ کی دریافت نے عہد اصلاح کے ساتھ تعاون کیا، اور تاریخ میں اٹلی کا کردار کچھ عرصہ کے لیے ختم کر دیا۔

بعدازاں 'نئی دنیا' کی ترقی نے یورپی اشیا کے لیے ایک وسیع منڈی کھولی اور یورپ کی فالتو آبادی کو ایک وسیع و عریض ملک ملا۔ یہ یورپ کی دولت اور طاقت میں تیز رفتار ترقی اور افریقہ و ایشیا و آسٹریلیا کی تسخیر کا راز ہے۔ امریکہ کی ساری تاریخ، عوامی حاکمیت اور عوامی تعلیم کے شعبوں میں تجربوں کے ساتھ، 1492ء کی اس عالی شان مہم کی دین ہے۔

11-1769ء— جیمز واٹ کا سٹیم انجن کو عملی استعمال میں لانا ...... اس واقعے نے صنعتی انقلاب کا آغاز کیا۔ سکندریہ کے ہیرو نے 130 میں ایک سٹیم انجن بنایا تھا؛ ڈیلا

پورٹا، Savery اور نیوکومین بالترتیب 1601، 1698ء اور 1705ء میں اس سے بہتر انجن بنا چکے تھے؛ لیکن آخری کڑی واٹ نے فراہم کی اور دنیا کو بدل کر رکھ دیا۔

بنیادی طور پر انسانی تاریخ میں صرف دو اساسی اور کلیدی واقعات ہیں: اول، زرعی انقلاب، جس میں انسان شکار کے دور سے گزر کر کھیتی باڑی اور مستقل رہائش گاہ، سکولوں اور ایک تہذیب کے مرحلے تک آئے؛ دوم، صنعتی انقلاب جس نے پہلے انگلینڈ، پھر امریکہ و جرمنی، اس کے بعد اٹلی و فرانس اور پھر دور دراز جاپان اور اب چین میں، سوویت یونین اور ہندوستان میں کروڑوں انسانوں کو اپنے گھروں سے کھیتوں سے اٹھا کر شہروں اور فیکٹریوں میں لا پھینکا ہے۔ اس نے مشینری کے مالکان کو محض خطابات اور زمین کے مالکان رہنے کے بجائے بااختیار بنانے کے ذریعے معاشرے و حکومت کی ہیئت بدلی۔ اس نے سائنس اور اس کے معجزات کے ذریعے مذہب کا حلیہ بدلا اور بہت سے آدمیوں کو علت و معلول اور مشینوں کے حوالے سے سوچنے پر مائل کیا۔ اس نے پرانے اجدادی اور گھریلو معاملات کی جگہ انوکھے اور متنوع محرکات لانے (جن میں سوچ لازمی تھی) کے ذریعے ذہن کو بدلا۔ اس نے عورت کو گھر سے کام پر لیجانے اور فیکٹریوں میں زبردستی رکھنے کے ذریعے بدلا۔ اس نے اقتصادی زندگی کو پیچیدہ بنانے، شادی کو موخر کرنے، خاندان کو گھٹانے اور مذہبی و والدینی حاکمیت کو کمزور بنانے کے ذریعے اخلاقیات میں تبدیلی پیدا کی۔ اور اس نے خوب صورت کو استعمال کا تابع بنانے، اور آرٹسٹ کو ذوق کے چند موروثی معیاروں کے بجائے قوت اور قیمت اور سائز کے حساب سے رائے دینے والے عوام کا ماتحت بنانے کے ذریعے آرٹ کی تقلیب کی۔

یہ سب کچھ چاہے ناقابل یقین لگتا ہے، لیکن جیمز واٹ کی اِس واحد ایجاد میں پنہاں ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ — سرمایہ داری، اشتراکیت، سامراجیت (جو صنعتی اقوام کو غیر ملکی منڈیوں اور غیر ملکی خوراک کی ضرورت محسوس ہونے پر لازمی تھی)، اور منڈیوں کی خاطر جنگیں، اور ان جنگوں کے نتیجے میں رونما ہونے والے انقلابات۔ حتیٰ کہ عظیم جنگ، اور روس میں وسیع پیمانے پر تجربہ بھی صنعتی انقلاب کی فطری نتائج تھے۔ 1769ء سارے جدید عہد کا نقطۂ آغاز ہے۔

12-1789ء — **انقلابِ فرانس** ......انقلابِ فرانس کو صرف اپنے آپ تک محدود واحد واقعے کے طور پر نہیں لینا چاہیے۔ یہ صدیوں سے جمع ہوتے آرہے اقتصادی اور نفسیاتی حقائق کا سیاسی نشان تھا۔ شاید اس کا آغاز 1543ء میں ہوا جب کاپرنیکس نے اپنی کتاب ''On the Revolutions of the Celestial Orbs'' شائع کی؛ کیونکہ تب دیوتاؤں کی شام ڈھلنے لگی اور انسان کی آزادی کا سورج طلوع ہونے لگا۔ کرۂ ارض اب مرکز نہیں رہا تھا۔ یہ یقین کرنا پڑا کہ انسانیت حیاتیات میں ایک عارضی وقفہ ہے، حیاتیات ارضیات میں درمیانی وقفہ ہے (جیسا کہ کوئی بھی زلزلہ ہمیں یاد دلاتا ہے) اور ارضیات فلکیات میں عارضی وقفہ۔ اس ناچیز دھرتی پہ محبوس انسان کو اپنے لیے غور و فکر کرنا پڑا۔ فکر آزاد اور بے حدود ہوگئی اور اس نے توہمات اور کلیسیائی احترام کے خلاف لڑائی لڑی۔ تب پورا عہد ایک لکھاری کے نام سے منسوب ہوا، اور وولٹیئر کہہ سکا، ''میرے پاس کوئی عصائے شاہی نہیں، لیکن میرے پاس ایک قلم ہے۔''

میں نے ہمیشہ فرانسیسی احیاالعلوم کی تعریف وتوصیف کی ہے؛ میں اسے انسانی تاریخ کی اوج سمجھتا ہوں جو پیریکلیز کے یونان یا آگسٹس کے روم یا میڈیچی کے اٹلی سے بھی عظیم تر ہے۔ انسانوں نے کبھی بھی اس قدر جراتمندانہ انداز میں نہیں سوچا، اس قدر شاندار انداز میں بات نہیں کی یا خود کو ثقافت اور انکساری کے زیادہ بلند معیار تک نہیں لے گئے۔ لوئی XVI نے اپنے قیدخانے میں وولٹیئر اور روسو کی کتب کے سامنے کھڑے ہوئے کہا تھا، افسوس! یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے فرانس کو تباہ کر ڈالا۔'' ہاں، انہوں نے ایک فرانس کو تباہ کر دیا تھا، لیکن انہوں نے ایک اور فرانس کو آزاد کیا۔ اپنے شاگردوں واشنگٹن، فرینکلن اور جیفرسن کے ذریعے امریکہ کو آزاد کرنے کی بات الگ ہے۔

بحرالکاہل میں دور افتادہ مقام پر، دو نصف کروں اور دو ادوار کے درمیان مَیں زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہوں۔ میں پیچھے مشرق پر نظر ڈالتا اور دیکھتا ہوں کہ کیسے ایک کنفیوشسی محقق اور ایک ہندو براہمن میری دی ہوئی تاریخوں پر مسکرائیں گے۔ ایک خوش اخلاقی سے پوچھے گا کہ میری فہرست میں تانگ سلطنت کہاں ہے — ایک دور جو چین میں ویسا ہی عظیم تھا جیسا فرانس میں احیا

العلوم کا دور۔ دوسرا پوچھے گا کہ اکبر یا اشوک کا کیا ہوا! اور میں جواب میں بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ اشوک کا تعلق بدھ سے ہے اور اکبر کا پیغمبر اسلامؐ سے۔

میں جانتا ہوں کہ یہ تمام فہرستیں کس قدر جانب دارانہ اور مخصوص علاقے سے متعلق ہوں گی۔ ہم سب زمان و مکان کی سرحدوں کے اندر پیدا ہوتے ہیں اور چاہے کتنی بھی جدوجہد کر لیں مگر اپنے ڈبوں سے کبھی باہر نہیں نکل پاتے۔ ہمارے لیے تہذیب کا مطلب ہے یورپ اور امریکہ، اور ہمیں بربری خیال کرنے والے مشرق کو ہم بربری سمجھتے ہیں۔

قاری کو چاہیے کہ وہ اپنی فہرستیں بنائے اور دیکھے کہ میری بنائی ہوئی فہرستوں میں اسے کیا پسند ہے۔ آپ اپنے لیے ایک اور تناظر اور یگانگت تعمیر کریں جو انسانی ترقی کو عیاں کرے۔ اور وہ الفاظ یاد رکھیں جو نپولین نے سینٹ ہیلینا کے مقام پر Reichstadt کے ڈیوک سے کہے تھے:
''خدا کرے کہ میرا بیٹا تاریخ کا مطالعہ کرے، کیونکہ یہ واحد حقیقی نفسیات اور واحد سچا حقیقی فلسفہ ہے۔''

مترجم کا نوٹ

ایک جائزہ

ول ڈیوانٹ مشہور کتب ''Story of Civilization'' اور ''Story of Philosophy'' کا مصنف ہونے کے باوجود مورخ یا فلسفی ہونے کا دعویدار نہیں تھا۔ تاریخ و فلسفے کی سنجیدہ اور تحقیقی کتب میں اس کی تحریروں کے حوالے بھی بہ مشکل ہی ملیں گے۔ شاید اس کا مقام وہی ہے جو سائنس میں کارل ساگاں کا۔ ہم اس کی سائنسی کامیابیوں یا کارناموں یا تحقیقات کے متعلق کچھ نہیں جانتے، لیکن اس نے سائنس کو عوام تک سادہ اور خوب صورت انداز میں پہنچایا اور مقبول بنانے میں کردار ادا کیا۔ یہاں ول ڈیورانٹ کے نکتۂ نظر پر مختصر سی تنقید پیش کرنا مقصود ہے۔

ایک فلم میں ڈائیلاگ تھا: ''انسان دو طرح کے ہیں: ایک جو جم کر لڑتے ہیں، اور دوسرے وہ جو سہارا یا پناہ ڈھونڈتے ہیں؛ اور موخر الذکر کا کیا ہوا انتخاب بہتر ہے۔'' اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ بہتر کی خاطر جدوجہد کرنے کے بجائے جو کچھ بھی موجود ہے اسی سے حتی الامکان حظ اٹھانا چاہیے۔

غالباً کچھ لوگ اسے فراریت سے تعبیر کریں گے۔ لیکن راقم کو ول ڈیورانٹ کا تاریخ کے بارے میں نکتۂ نظر اس سے قریب قریب لگتا ہے۔

اس کی نظر میں ماضی ایک ارتقائی عمل اور زمانہ حال اس کی بہترین پیداوار ہے جس میں سابقہ ادوار کی بہترین چیزوں کا ورثہ بھی موجود ہے۔ وہ انسانی ترقی کے مدارج اور جینیئس کے ظہور کو ایک طرح سے خودرو اور ''فطری'' عمل کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ ساتھ ساتھ وہ تاریک پہلوؤں کی لیپا پوتی بھی کرتا اور ڈھارس بندھاتا ہے کہ بہت کچھ ابھی آنا باقی ہے: ''غلام کو انقلاب کے بجائے ایجاد آزادی دلائے گی۔'' یعنی انسان کو پابہ زنجیر کرنے والی مشینیں انجام کار اسے آزادی بھی دلائیں گی، مگر کیسے؟ یہ اس کا موضوع نہیں، اور نہ ہی اس کیسے کا جواب دینے کی کوشش کرنے والے اہل فکر میں اسے زیادہ دلچسپی ہے۔ اس کے لیے کولمبس کا امریکہ دریافت کرنا انسانی ترقی کی راہ میں زیادہ بڑا قدم ہے، نہ کہ دیسی امریکی باشندوں کا اپنی تہذیب کو جاری رکھنا۔ اگر آپ اس کے پہلو بہ پہلو انسان، آزادی، خوب صورتی وغیرہ جیسے مجرد تصورات کی تائید بھی کریں تو پیراڈاکسز پیش آنا ناگزیر ہے۔ نیز ہمیں یہ بھی معلوم نہیں ہو پاتا کہ ''انسان'' یا ''آزادی'' کی کیا تعریف ہے۔ وہ جدید سیاسی نظاموں اور سہولیات پر تشکیک کا اظہار کرتا ہے۔ اس کا نکتۂ نظر خوب صورت انداز میں elitist بھی ہے۔ عوام یا عام لوگ تہذیب کی اعلیٰ ترین کامیابیوں، جینیئس کے کارناموں یا حسین فن پاروں کا محض خام مال ہیں، نہ کہ قوت محرکہ۔ وہ جدلیاتی مادیت یا طبقات کی جنگ سے زیادہ انسانی جذبے کو صیقل کیے جانے کی تمنا میں دلچسپی رکھتا ہے۔ بیسویں صدی کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک کا شہری ہونے اور یورپ کو ساری انسانی عقل کا محور ماننے کی وجہ سے ایسا ہونا لازمی تھا۔ وہ تہذیب کی تاریخ کو ایک سیر شکم اور فراغت کے حامل امیر شخص کی طرح دیکھتا ہے۔ اور شاید گرو رجنیش عرف اوشو کی طرح اس کی مقبولیت کی وجہ بھی یہی ہے۔ وہ آرٹ اور ادب کے نام پر مذہب کو بھی پوری طرح قبول کرنے کو تیار ہے۔

ول ڈیورانٹ کچھ جگہوں پر قابلِ اعتراض حد تک اعتذار پسند ہے اور کہیں کہیں قابل گریز حد تک رومانوی۔ اسے تاریخ کی غلط کاریوں کے بجائے رعنائیوں میں زیادہ دلچسپی ہے، بالخصوص

ایسی رعنائیاں جسے یورپ پر مرکوز اور کچھ حد تک امریکہ کی ابھرتی ہوئی طاقت پر مبنی ذہن نے جنم دیا۔ بیسویں صدی کے پیش کردہ مسائل کے لیے اس کے پاس محض ماضی کی مہیا کردہ رومانوی سچائیوں کے سوا کچھ نہیں۔ اس کی نظر میں ماضی (کنفیوشس اور بدھ کو چھوڑ کر، جو دوسری عالمی جنگ کے بعد اہل مغرب کو بہت پسند آئے) یورپی روایت سے باہر بہ مشکل ہی قابل ذکر ہے۔ چند جگہوں پر الحمرا، اشوک اور تاج محل کا ذکر بھی اسے نام نہاد مشرق سے انحراف کا تاثر پیدا کرنے سے محفوظ نہیں رکھ پاتا۔ اس کا عمر خیام بھی انگلش مصنفین اور مترجمین کی دین ہے۔

اس کی تحریر بیسویں صدی کی فلموں کی طرح ہے جن میں قدیم کہانیوں کے اساطیری کردار اور سورما (گلیڈی ایٹرز اور بریوہارٹ) ہی جینئس مردان عمل اور آزادی کے متوالے ہیں، جبکہ جدید زندگی کے ہیرو اصل میں اینٹی ہیرو ہیں ـــ ذاتی قابلیت دکھانے کے مواقع اور صلاحیت سے محروم کیے گئے۔

اس سب کے باوجود وہ پرکشش اور خوب صورت انداز میں اپنی شاعرانہ تحریر پیش کرتا ہے۔ یہ تقریباً 125 صفحات کم از کم تہذیب کے ایک پہلو اور اسے دیکھنے کے طریقۂ کار سے ضرور متعارف کرواتے ہیں۔ شاید دوسرا طریقۂ کار ابھی پوری طرح وضع ہی نہیں ہوا۔

راقم الحروف مصنف کے انداز تحریر اور طریقۂ استدلال کا معترف ہے۔ وہ تاریخ، معیشت، تہذیب، ایجادات، فکر، مذہب، وغیرہ کے مختلف دھاروں کو ساتھ لے کر چلتا اور قاری کے مسائل سے آگاہ ہے۔ زیر نظر کتاب اس کے کُل کام کا خلاصہ ہونے کی وجہ سے کافی جامع ہے اور کہیں کہیں قاری سے کچھ پیشگی معلومات رکھنے کا تقاضا بھی کرتی ہے۔

پاکستان میں اس کی کتابیں تقریباً پچاس سال سے ترجمہ ہو رہی ہیں۔ ''سٹوری آف فلاسفی'' کا ترجمہ سید عابد علی عابد جبکہ ''Pleasures of Philosophy'' کا پروفیسر محمد اجمل نے کیا۔ 80ء کی دہائی کے اواخر میں ظفر الحسن پیرزادہ نے ''سٹوری آف سویلائزیشن'' کے دیباچے کا ترجمہ کتابی صورت میں شائع کروایا۔ اسی کتاب کی پہلی جلد ''Our Oriental Heritage'' کے ایک حصے کا ترجمہ ''ہندوستان'' کے نام سے طیب رشید نے 90ء کی دہائی کے اوائل میں کیا، جبکہ مصر،

اشور، بابل ونینوا اور یہودیہ کے متعلق ابواب میں نے ''عرب'' کے نام سے اکٹھے کیے۔ اس کے بعد 2001ء میں پوری ایک جلد ''Renaissance'' کا ترجمہ شائع کروایا، اور پھر ''ہیروز آف ہسٹری'' اردو میں منتقل کی جو مصنف کی وفات کے باعث ادھوری ہی رہ گئی تھی۔ زیرِ نظر کتاب کو اس کا تکملہ سمجھنا چاہیے۔ علاوہ ازیں ول ڈیورانٹ کی کتاب ''Mansions of Philosophy'' کے پہلے حصے کا اردو ترجمہ ''فلسفہ اور محبت'' کے نام سے ہو چکا ہے۔

مترجم

اہم ناموں اور جگہوں کا اشاریہ

ول ڈیورانٹ (1885-1981ء) امریکی فلسفی، تاریخ دان اور مورخ تھا۔ وہ اپنی بیوی ایریئل کے ساتھ مل کر لکھی ہوئی ''دی سٹوری آف سویلائزیشن'' کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ ول ڈیورانٹ میساچوسٹس میں جوزف ڈیورانٹ اور میری ایلارڈ کے ہاں پیدا ہوا جو کیوبیک سے نقل مکانی کر کے یو ایس آئے تھے۔ 1900ء میں اس نے سینٹ پیٹر سبرگ سے تعلیم مکمل کی اور پھر جرسی سٹی کے سینٹ پیٹرز کالج میں گیا۔ 1905ء میں وہ سوشلسٹ بن گیا اور دو سال بعد گریجوایشن کی۔ اس نے ایک جریدے میں دو ڈالر فی ہفتہ تنخواہ پر نوکری کی اور بعد ازاں کئی جرائد میں جنسی مجرموں پر مضامین لکھے۔ 1907ء میں اس نے سٹین ہارل یونیورسٹی نیو جرسی میں لاطینی، فرانسیسی، انگلش اور جیومیٹری پڑھانا شروع کی۔ 1911ء میں فیرر ماڈرن سکول میں پڑھانے کی ملازمت اختیار کی۔ وہیں پر اپنے سے عمر میں تیرہ برس چھوٹی خاتون Chaya Kofman عرف ایریل کے ساتھ اسے محبت ہوئی اور دونوں نے شادی کر لی۔ ان کی ایک بیٹی پیدا ہوئی اور انہوں نے ایک بیٹا بھی گود لیا۔

1917ء میں فلسفہ میں ڈاکٹریٹ ڈگری پر کام کرتے ہوئے ول ڈیورانٹ نے اپنی پہلی کتاب "Philosophy and the Social Problem" لکھی۔ ''دی سٹوری آف فلاسفی'' کا آغاز مزدوروں کے لیے لکھے ہوئے مختصر پمفلٹوں کی صورت میں ہوا۔ 1926ء میں ایک بڑی امریکی پبلشر نے ان پمفلٹوں کو کتاب کی شکل دی۔ اس نے پڑھانا چھوڑا اور گیارہ جلدوں پر مشتمل ''دی سٹوری آف سویلائزیشن'' لکھنے میں لگ گیا۔

ول ڈیورانٹ کی موت کے بعد اس کی دو کتابیں "The Greatest Minds and Ideas of All Time" (2002ء) اور "Heroes of History" (2001ء) میں شائع ہو چکی ہیں۔ دونوں میاں بیوی 1981ء میں چند دن کے وقفے سے یعنی 25 اکتوبر اور 7 نومبر کو فوت ہوئے

نگارشات پبلشرز
24 مزنگ روڈ، لاہور۔ پاکستان
Ph: +92-42-37322892 Fax: 37354205
E-mail: nigarshat@yahoo.com
www.nigarshatpublishers.com